رشید امجد کے افسانوں میں جبر اور خوف کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

("دکھ ایک چڑیا ہے" کے افسانوں کے حوالے سے)

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار

محمد فاروق



نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

جون، ۲۰۲۱ء

رشید امجد کے افسانوں میں جبر اور خوف کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

("دکھ ایک چڑیا ہے" کے افسانوں کے حوالے سے)

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار

محمد فاروق

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو ئجز

(اُردو زبان و ادب)



نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

جون، ۲۰۲۱ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگو یجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: رشید امجد کے افسانوں میں جبر اور خوف کے عناصر؛ تجزیاتی مطالعہ

("دکھ ایک چڑیا ہے" کے افسانوں کے حوالے سے)

پیش کار: محمد فاروق **رجسٹریشن نمبر:** F18-U-MP-1585

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان وادب

ڈاکٹر شفیق انجم: ----------------

نگران مقالہ

ڈاکٹر جمیل اصغر جامی : ----------------

ڈین فیکلٹی آف لینگو یجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان: ----------------

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ: --------------

اقرارنامہ

میں، محمد فاروق حلفیہ بیان کرتاہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو بجز، اسلام آباد کے ایم۔فل اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر شفیق انجم کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

محمد فاروق

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو بجز، اسلام آباد

جون، ۲۰۲۱ء

فہرست ابواب

Abstract

Rasheed Amjad is the most prominent name in Urdu literature. For six decades, he has made every aspect of his era and society as his subject. Rasheed Amjad writes of uncomfortable moments amidst the breakdown of the changing system.The problems of contemporary life are well depicted in his fiction.He has described the tragedies of society his special subject.He illustrates the depressed people.These are real pictures of a society mired in problems of determinism and fear. In Rashid Amjad's subjects, there is a process of retrieval instead of a process of discovery. This retrieval is part of their myths in historical, cultural, social and psychological terms. His stories contain a complete philosophy of life. Rasheed Amjad's philosophy of life and death, the state of uncertainty, the continuity of the non-existent from the present, the external and internal situation, the conflict of authority and powerlessness, the state of reflexes are made special topics. In which there is a combination of external and internal life.

His fictions also represent the modern life of the individual. Whose social and psychological perspectives are viewed from new angles in this article. Their characters are suffering from social chaos, anguish, determinism, and fear which are reflections of our society. Also, in his fiction, themes such as change in social and human attitudes, division of family system, and internal collapse with relationship breakdown, depression, anxiety, and loneliness are prominent. These stories specifically point out how the individual suffers from coercion and fear due to mechanical progress. At the mechanical level, the collision of entry and exit is made part of the story on psychological grounds. The article under review looks at the situation of determinism and fear in Rashid Amjad's fictions from a social and psychological perspective.

Keeping in view the subject research, the basic source "دکھ ایک چڑیا ہے" has been studied. The text of the fiction goes through an analytical process in the prescribed context, marking the effects of the subject. Discussions of the three books of philosophy, while discussions of the theories of Freud and Zhang, have been considered for understanding the social and

psychological meaning of determinism and fear. Apart from this, dictionaries and various discoveries have also been used. The situation of determinism and fear in Rasheed Amjad's fictions and the presentation has been examined in a socio-psychological context keeping in view the discussions of scholars. The social and psychological aspects of determinism and fear have been marked with the reading of critical books on the personality and art of Rasheed Amjad and critical books on fiction.



اظہارِ تشکر

اللہ رب العزت کا بے حد شکر گزار ہوں جس کے فضل و کرم سے یہ مرحلہ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ بے شک اللہ کی مہربانی کے بغیر یہ صبر آزما سفر طے کرنا مشکل تھا۔ اس کے بعد میں اپنی والدہ محترمہ کا شکر گزار ہوں جن کی محبت، شفقت اور دعاؤں کا سایہ ہمیشہ مجھ پر رہا۔ میں اپنے نگرانِ مقالہ جناب ڈاکٹر شفیق انجم کا بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنی نگرانی میں کام کرنے کا موقع دیا اور دورانِ تحقیق ہر طرح کی معاونت اور رہنمائی فرمائی۔ میں دیگر اساتذہ کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے کورس ورک سے لے کر مقالہ کی تکمیل تک تعاون کیا۔ ان واجب الاحترام اساتذہ میں نمل یونیورسٹی اسلام آباد کے صدرِ شعبہ اردو ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ ، ڈاکٹر روبینہ شہناز صاحبہ، ڈاکٹر عابد سیال صاحب ، ڈاکٹر نعیم مظہر صاحب، ڈاکٹر محمود الحسن صاحب، ڈاکٹر صائمہ نذیر صاحبہ، ڈاکٹر رخشندہ مراد صاحبہ، ڈاکٹر نازیہ یونس صاحبہ ، ڈاکٹر ارشاد بیگم صاحبہ اور دیگر اساتذہ شامل ہیں۔ ان تمام اساتذہ کرام کی علمی بصیرت کی بدولت میرے علم و دانش میں اضافہ ہوا۔ جنھوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالے کی تکمیل تک ہر قدم پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔

میں اپنے ان احباب کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے مواد کی فراہمی اور دیگر تحقیقی امور میں مدد فرمائی۔ ڈاکٹر طاہر نواز، ڈاکٹر مجاہد عباس، پروفیسر فاروق ملک ،ارشد محمود ہادیؔ، اعجاز رازق، سید کاشف نقوی اور دیگر دوستوں، ہم جماعتوں اور کرم فرماؤں کا بھی بے حد شکر گزار ہوں جو موضوع کے انتخاب سے لے کر تحقیقی مقالے کی تکمیل تک معاون رہے۔ میں اپنے تمام گھر والوں کا بھی شکر گزار ہوں جو میرے لئے آسانیاں پیدا کرنے میں پیش پیش رہے۔ آخر میں ایک بار پھر میں اپنے نگران مقالہ ڈاکٹر شفیق انجم صاحب کا سپاس گزار ہوں جنھوں نے ہمہ وقت رہنمائی فرمائی حتیٰ کہ کورونائی حالات میں بھی انھوں نے ہر طرح سے معاونت فرمائی، موضوعِ تحقیق کے انتخاب سے لے کر تکمیلِ مقالہ تک ہمیشہ اُن کا ساتھ رہا اور ان کے تنقیدی و تحقیقی شعور نے اس کٹھن کام کی تکمیل کو ممکن بنایا۔ رشید امجد جیسے نابغے پر کام کرنا میرے لیے باعث اعزاز تو ہے ہی، اُن کے شاگردِ خاص جناب ڈاکٹر شفیق انجم کی نگرانی میں کام کرنا بھی میرے لیے باعثِ افتخار ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ سلامت رکھے آمین۔

محمد فاروق (ایم فل اردو اسکالر)

باب اول

موضوعِ تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث

الف: تمہید

i. موضوع کا تعارف

رشید امجد نے افسانہ نگاری کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں کیا۔ یہ افسانہ نگاری میں جدت کا دور تھا۔ کلاسیکی افسانے کی جگہ جدید افسانہ لکھا جارہا تھا۔ معاصر افسانہ نگار اپنی فنی صلاحتیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے جدید افسانے کو ترقی دے رہے تھے۔ رشید امجد نے زندگی کے خارجی و داخلی پہلوؤں کو دیکھا، پرکھا، سمجھا اور قلمبند کیا۔ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں حالات و واقعات میں تغیر و تبدل تیزی سے رونما ہوتا رہا، رشید امجد ان حالات و واقعات کا حصہ رہے، جس کو علامتی پیرائے میں ڈھال کر آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر لیا۔ رشید امجد کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ گزشتہ چھ دہائیوں میں ان کے ۱۳/ افسانوی مجموعے اور ۲/ افسانوی کلیات شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا مجموعہ "دکھ ایک چڑیا ہے" ۲۰۱۶ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے شائع کیا۔ یہ مجموعہ ان کی تخلیقیت کی عمدہ مثال ہے۔ اس مجموعے میں رشید امجد کے مرکزی موضوعات جبر اور خوف ایک نئے انداز میں کہانیوں کا موضوع بنتے ہیں۔ جبر ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے ذریعے سے سماجی و انفرادی سطح پر اس صورت حال سے بخوبی آگاہی ملتی ہے۔ اسی طرح خوف کی مختلف صورتیں اور محرکات ہیں جن کی علمیاتی بنیادیں گوناگوں ہیں۔ رشید امجد نے اپنے افسانوں پر بڑی تفصیل سے انفرادی اور سماجی سطح پر ہر دو قسم کی صورتحال کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔ زیر نظر مقالے میں "دکھ ایک چڑیا ہے" کے افسانوں کا اسی تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے اور اس مجموعے میں شامل افسانوں کے حوالے سے رشید امجد کے ان ترجیحی موضوعات کی نئی صورتوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ رشید امجد کی زیر تحقیق کہانیاں معاصر زندگی کی بے چہرگی، جبریت اور خوف کی عکاس ہیں۔ جبریت کے حوالے سے 'کشاف تنقیدی اصطلاحات' کی وضاحت کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کی پانچ واضح صورتیں ہیں یعنی تقدیری جبر، نفسیاتی جبر، تاریخی جبر، عمرانی جبر اور وراثتی یا نسلی جبر۔ رشید امجد کے افسانے بھی انھی صورتوں کے مختلف زاویوں کے عکاس ہیں۔ انہوں

نے فرد کے جبر حیات کو علامتی انداز میں بہ خوبی بیان کیا ہے اس حوالے سے ان کے افسانے شام کہانی، کچھوے کی موت، رائیگاں کی دھول وغیرہ اہم ہیں۔ رشید امجد فرد پر سماجی اداروں کی جبری و خوف زدہ صورتحال کو بھی اپنی کہانیوں میں اجاگر کرتے ہیں جن میں بوڑھے والدین کی زندگی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جس سے ان کی زندگی جبر اور خوف کا شکار ہے۔ عام آدمی کی زندگی پر سیاست، مذہب اور معاش کی بدولت جبر اور خوف کو بھی بہ طور خاص منظر عام پر لایا گیا ہے۔ رشید امجد فرد کی داخلی ٹوٹ پھوٹ کو اپنی کہانیوں میں نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے افسانے "لذت کا خوف"، "ڈائیری کا نیا صفحہ "، اضطرابِ شام تنہائی" وغیرہ نفسیاتی کشمکش اور داخلی جبر و خوف کے عکاس ہیں۔ ان کے افسانوں میں لاشعوری کشمکش ابھر کا سامنے آتی ہے جس میں فرد داخلی سطح پر جبر و خوف میں مبتلا ہے۔

ii. بیان مسلہ

رشید امجد کے افسانوں میں معاصر زندگی کے مسائل کو بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ تاہم انہوں نے جدید معاشرے سے وابستہ انسانی المیوں کو خاص طور پر اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کی کہانیاں ایک افسردہ معاشرے میں بوکھلائے ہوئے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ یہ جبر اور خوف کے مسائل میں الجھے ہوئے معاشرے کی حقیقی تصویریں ہیں۔ رشید امجد کے ابتدائی دور کے افسانوں میں بھی یہ موضوع ملتے ہیں تاہم ان کی جدید تر کہانیاں اس ضمن میں بہت توجہ طلب ہیں۔ ضروری تھا کہ ان کہانیوں کو ایک تحقیقی عمل کے ذریعے معاصر معاشرے میں جبر اور خوف کے محرکات کے تناظر میں سمجھا اور پرکھا جائے۔

iii. مقاصد تحقیق

۔ جبر اور خوف کی سماجی اور نفسیاتی معنویت کا جائزہ لینا

۔ رشید امجد کے افسانوں میں جبر اور خوف کی صورتحال کا جائزہ لینا۔

۔ رشید امجد کے افسانوں میں جبر اور خوف کی معنویت اور پیشکش کا تجزیہ کرنا۔

iv. تحقیقی سوالات

۔جبر اور خوف کی سماجی اور نفسیاتی معنوی جہات کیا ہیں؟

۔رشید امجد کے افسانوں میں جبر اور خوف کی صورتحال کی مختلف جہتیں کیا ہیں؟

۔رشید امجد کی افسانوں میں جبر اور خوف کی پیشکش کی مختلف صورتیں کیا ہیں؟

v. نظری دائرہ کار

رشید امجد کو اردو کے کم و بیش سبھی ناقدین نے ایک نمائندہ افسانہ نگار قرار دیا ہے اوران کے افسانوں کو معاصر زندگی کی بے چہرگی، جبر اور خوف کی صورتحال کا ترجمان کہا ہے۔ڈاکٹر محمد حسن، شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر مہدی جعفر، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر ناصر عباس نیر اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے خیال میں رشید امجد عصری زندگی کے نباض افسانہ نگار ہیں۔ناقدین نے رشید امجد کے ہاں جبر اور خوف کے عناصر کی بھی بہ تکرار نشاندہی کی ہے۔ زیر نظر مقالے میں رشید امجد کے افسانوں کا تجزیہ جبریت اور خوف کے سماجی و نفسیاتی تناظرات میں کیا گیا ہے۔ جس کے لئے Edword D Angleo کی کتاب The Problem of Free will، Clifford Willaims & Hacket کی کتاب freedom and Determinsim and Determinisim اور Will Durant کی کتاب The Plearsure of Philosphy کے مباحث پیش نظر رہے ہیں۔ جبکہ نفسیاتی جہات کی تفہیم کے لئے فرائیڈ، ژونگ کے نظریات کے مباحث سے استفادہ کیا گیا ہے۔ جس کے لیے چارلس سینگر کی کتاب 'Introduction to Psychology' اور کارل گستاؤ ژنگ کی کتاب Physcology of the Unconcious پیش نظر رہی ہے۔

vi. تحقیقی طریقہ کار

موضوع تحقیق کو مد نظر رکھتے ہوئے بنیادی ماخذ "دکھ ایک چڑیا ہے" کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ افسانوں کے متن میں موضوع کے آثار کو نشان زدہ کرتے ہوئے طے شدہ تناظر کے تحت تجزیاتی عمل سے گزارا گیا ہے۔ جبر و خوف کی سماجی و نفسیاتی معنوی جہات کی تفہیم کے لئے فلسفے کی تین کتب کے مباحث جب کہ فرائڈ اور ژانگ کے نظریات کے مباحث کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ لغات اور مختلف کشاف سے

بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ماہرینِ علم کے مباحث کو مدِ نظر رکھتے ہوئے رشید امجد کے افسانوں میں جبر اور خوف کی صورتحال اور پیشکش کا سماجی و نفسیاتی تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ رشید امجد کی شخصیت و فن پر لکھی گئی تنقیدی کتب اور فن افسانہ نگاری پر تنقیدی کتب کی خواندگی کے ساتھ جبر و خوف کے سماجی و نفسیاتی پہلوؤں کو نشان زد کیا گیا ہے۔

vii. مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

رشید امجد ادبی و علمی دنیا میں بطور نقاد، افسانہ نگار اور معلم کے طور پر اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات پر مختلف جامعات میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے متعدد مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ جن میں ان کے فن و فکر کو شامل تحقیق کیا گیا ہے۔ ان کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب اکادمی ادبیات اسلام آباد سے بھی شائع ہو چکی ہے۔ جبکہ میرے موضوع کے حوالے سے پہلے کام نہیں ہوا ہے۔ یہ ان کے مجموعہ "دکھ ایک چڑیا ہے" کے افسانوں کی بابت ہے۔ یہ مجموعہ ۲۰۱۶ء میں نیشنل بک فاونڈیشن سے شائع ہوا، جس کے کل ۵۱ افسانے ہیں۔

viii. تحدید

میرا موضوع رشید امجد کے افسانوں میں جبر اور خوف کے عناصر کا تجزیہ کرنا ہے، یہ تجزیہ ان کے افسانوی مجموعہ "دکھ ایک چڑیا ہے" کے حوالے سے کیا گیا ہے جو کہ کل ۵۱ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان افسانوں کے علاوہ ان کے قبل ازیں کے افسانوی مجموعوں کو پسِ منظری مطالعہ کے طور پر دیکھا گیا ہے تاہم اس تحقیق میں وہ شامل نہیں ہیں۔ مجوزہ تحقیق میں جبر اور خوف کی صرف سماجی اور نفسیاتی جہات ہی کو بنیاد بنایا گیا ہے جبکہ دیگر جہات شاملِ بحث نہیں ہیں۔ زیر نظر مقالے میں رشید امجد کے افسانوی مجموعے "دکھ ایک چڑیا ہے" کے ۳۹/ افسانوں کو شامل تحقیق کیا گیا ہے۔ سماجی تناظر میں جبر و خوف کی صورتحال اور پیشکش کے لئے ان کے جن افسانے پیش نظر رہے ہیں ان کے نام یہ ہیں: ۱۔ "تمنا بے تاب"۔ ۲۔ رائیگاں کی دھول"۔ ۳۔ عکس اور وجود کے درمیاں"۔ ۴۔ موسمِ بہار میں سوکھی ٹہنیاں"۔ ۵۔ "سبزہ زہراب"۔ ۶۔ "شام کہانی" ۔۷۔ "مٹی کی مہک"۔ ۸۔ "شہر گریہ"۔ ۹۔ "صحرا کہیں جسے"۔ ۱۰۔ "لذت کا خوف"۔ ۱۱۔ "خواب کے پیچھے پیچھے"۔ ۱۲۔ "دکھ ایک چڑیا ہے"۔ ۱۳۔ " کچھوے کی موت"۔ ۱۴۔ "ماتم بال و پر کا"۔ ۱۵۔ " فالتو

آدمی"۔۱۶۔"اپنی اپنی بلی"۔۱۷۔"ہنوز خواب میں"۔۱۸۔"وقت کے کوڑے دان میں"۔۱۹۔"افسوس حاصل کا"۔۲۰۔"تصویریں اور دیواریں"۔۲۱۔"گماں کے رشتے"۔نمایاں ہیں۔نفسیاتی تناظر میں جبر و خوف کی صورتحال اور پیشکش ان کے درج ذیل افسانوں کے متن کے ساتھ زیر بحث آئی ہے:۱۔"ڈائیری کا نیا صفحہ"۔۲۔"روایت"۔۳۔"اضطرابِ شام تنہائی"۔۴۔"طوطے کی موت"۔۵۔"پرندہ اداس ہے"۔۶۔"معلوم کا دکھ"۔۷۔"دشت خواب"۔۸۔"جاتی رت کے خواب"۔۹۔"خواب میں خواب"۔۱۰۔"مسکراتے لمحے سے نکلتی ایک افسردہ کہانی"۔۱۱"۔لمحہ ناموجود مین موجود"۔۱۲۔"خمار عشق"۔۱۳۔گل ہی نہ جانے"۔۱۴۔"خبطی"۔۱۵۔"انتظار"۔۱۶۔"اپنی اپنی بلی"۔۱۷۔"موسم بہار میں سوکھی ٹہنیاں"۔

.ix پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعہ میں معاصر افسانوی نثر کی تنقیدی کتب کے ساتھ رشید امجد کے افسانوں پر لکھی گئی تنقیدی کتب، جامعاتی مقالات، تبصرے، مضامین، تجزیے اور انٹریوز کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

.x تحقیق کی اہمیت

رشید امجد نے اپنے افسانوں میں سماج کی حقیقتوں کو علامتی پیرائے میں دکھایا ہے۔ان کے افسانے اپنے عہد کے عکاس ہیں۔اس تحقیق سے رشید امجد کی انفرادی و اجتماعی طور پر داخلی و خارجی ساخت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔زندگی اور موت کی کیفیات کو سمجھا جا سکتا ہے۔میرا موضوع چونکہ جبر اور خوف کے عناصر کا تجزیہ کرنا ہے لہٰذا اس سے سماج میں ان کیفیات کو انفرادی و اجتماعی سطح پر سمجھا جا سکتا ہے۔معاصر زندگی میں بہ طورِ خاص فرد کس طرح ان کیفیات سے گزر رہا ہے، زیر نظر تحقیق سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ب۔ جبر اور خوف کی سماجی اور نفسیاتی جہات: بنیادی مباحث

انسان فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے۔انسان کی پیدائش اور ارتقائی عمل صدیوں پر محیط ہے۔مختلف ادوار میں انسانی زندگی تغیر و تبدل سے دوچار رہی۔انسانی ارتقا میں مختلف زبانوں، تہذیبوں اور مذاہب سے وابستہ لوگوں نے گروہ کی شکل اختیار کی جسے سماج کا نام دیا گیا جو ایک اجتماعی زندگی کے تصور کی صورت میں سامنے

آیا۔ یہ اجتماعی زندگی چند بنیادی ضرورتوں پر مبنی ہے۔ جن میں عمومی طور پر خاندانی، معاشی، مذہبی،، سیاسی اور تعلیمی ضروریات قابلِ ذکر ہیں۔ ان ضروریات کی وجہ سے سماج کے آپسی روابط قائم ہوتے گئے۔ سماجی ضروریات نے انسان کو ایک دوسرے کے ساتھ میل جول، رشتہ داری، برادری، تجارت، لین دین اور عبادت جیسے روابط استوار کرنے پر مجبور کیا۔ جس کے نتیجے میں زندگی کی آسائشوں کے ساتھ کئی مسائل نے بھی جنم لیا۔ مثلاً گھریلو مسائل، مذہبی فرقہ بندی، سیاسی عدم استحکام، جنگ وجدل، دہشت گردی، امن و امان کا مسئلہ، بدیانتی، کرپشن، لوٹ مار اور عصمت دری وغیرہ۔ یہ مسائل فرد کی خارجی و داخلی زندگی پر اس قدر اثر انداز ہوئے کہ وہ جبر اور خوف کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا۔ اس ناآسودہ زندگی نے فرد کو انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر جبر اور خوف جیسی کیفیات میں مبتلا کیا۔ عائشہ بیگم اپنی کتاب 'تاریخ اور سماجیات' میں لکھتی ہیں:

> "سماجی نظام کے تمام اجزا ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر اس نظام کا کوئی جزو ناقص یا ناکارہ یا فرسودہ ہو جائے تو اس کی وجہ سے پورا نظام ایک مرضیاتی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے"۔[۱]

سماجی زندگی کا مطالعہ خاندانی، معاشی، مذہبی، سیاسی، تعلیمی، نفسیاتی، روایاتی، تمدنی، تہذیبی و دیگر عوامل کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ اکثر سماجی مسائل کی وجہ سے جبر اور خوف کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، ہر دو کیفیات ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ جبر کے نتیجے میں خوف جنم لیتا ہے اور خوف کے نتیجے میں جبر۔ یہ دونوں صورتحال بیک وقت اور الگ الگ انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ سماجی عناصر کا تعلق انسان کے خارج سے ہے اور نفسیاتی عناصر کا انسان کے داخل سے۔

انسان کی ابتدائی زندگی خارجی مسائل سے زیر بحث رہی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ داخل کو بھی زیر بحث لایا جانے لگا، جس کے نتیجے میں نفسیات کے علم کا آغاز ہوا۔ خارج اور داخل کے باہمی تعلق سے نئی جہات سامنے آئیں۔ انسانی سائیکی کے نئے روپ دکھائی دیے۔ فرائڈ اور ژونگ کے نظریات نے نفسیات کو سائنس کے درجے تک پہنچا دیا۔ خارج اور داخل کے تصادم نے فرد کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا جس سے جبر اور خوف کی فضا پیدا ہوئی۔

'جبر 'اور'خوف' کے مفہوم کو سمجھنے اور معنوی جہات تک رسائی حاصل کرنے کے لئے مختلف لغات اور کشاف میں دی گئی تعریفیں درج ذیل ہیں۔

1. جبر/جبریت

۱۔ فیروز الغات: "جبر" عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے دباؤ، زور، زبردستی، ظلم و ستم، مجبوری، طاقت کا استعمال"۔[۲]

۲۔ نور الغات: "ظلم و ستم، دباؤ، جوروجفا، (حساب) کسرات کا استعمال، چاروناچار، مجبوری سے"۔[۳]

۳۔ فرہنگ آصفیہ: "زیادتی، سختی، بے رحمی، زبردستی، سینہ زوری، ظلم و ستم، دباؤ، جوروجفا"۔[۴]

۴۔ فرہنگ عامرہ: "زبردستی، پٹی، زبردستی کام لینا، زیادہ کرنا"۔[۵]

فلسفۂ جبر، عقیدہ جبر یا جبریت کا انگریزی میں متبادل لفظ Determinism ہے۔

۵۔ فرہنگ اصطلاحات: "Determinism کا اردو میں مخفف 'جبریت' ہے"۔[۶]

۶۔ دی آکسفورڈ انسائیکلوپیڈک انگلش ڈکشنری:

Determinisim :

"The doctrine that all events, including human action are determined by causes regarded as external to the will".[7]

۷۔ اوکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری:

(Determinism) "فلسفۂ جبریت، یہ نظریہ کہ تمام واقعات، حادثات مع اعمال انسانی حقیقتہً غیر ارادی اور ایسے اسباب کا نتیجہ ہیں جن پر انسان کو قدرت نہیں"۔[۸]

۸۔ کشاف اصطلاحات فلسفہ (اردو-انگریزی) :

جبریت یافلسفۂ جبر:

"ایک عمومی فلسفیانہ عقیدہ کہ ہر وہ شے جو وقوع میں آئے اس سے وابستہ ایسی شرائط ہیں کہ اگر وہ پوری ہوں تو اس کے علاوہ کچھ وقوع پذیر نہیں ہو سکتا جیسا کہ ہوا۔ تاریخ فلسفہ میں جبریت کی کئی صورتیں ہیں، ایک تصور جو عام ہے اس کے مطابق کائنات میں ہر واقعہ قانون کے مطابق ہوتا ہے"۔ (۹)

۹۔ قومی انگریزی لغت:

"(فلسفہ) جبریت (Determinism): نظریہ جبر۔ یہ نظریہ کہ جملہ موجودات و واقعات سابقہ حالات کالازمی نتیجہ ہوتے ہیں اور خصوصاً یہ کہ انسان کے عمل اس کے آزاد ارادے پر منحصر نہیں، بلکہ ان کا تعین توریثی یا ماحولی اثرات کے تحت ہوتا ہے"۔ (۱۰)

۱۰۔ کشاف اصطلاحاتِ فلسفہ: جبریت، (Determinism)

"جبریت کا کہنا ہے کہ علیت کا قانون تمام مظاہر فطرت پر حاوی و ساری ہے۔ اس کی حیثیت خارجی ہے موضوعی نہیں"۔ (۱۱)

۱۱۔ ویبسٹر ڈکشنری: Determinism is :

"The doctrine that man's choices, decisions and actions are decided by antecedent causes, inherited or environmental, acting upon his character: opposed to free will". (12)

۱۲۔ کشاف اصطلاحاتِ سیاسیات:

"جبریت، عقیدہ جبر (Determinisim): انسان کے فاعل مختار ہونے کی نفی کرنے والا عقیدہ۔ اس کے مطابق انسان کے ارادے کا تعین کوئی اور قوت کرتی ہے"۔ (۱۳)

2. خوف

۱۳:فیروالغات: "خوف:ڈر،ہول،دہشت"۔[۱۴]

۱۴۔نورالغات: "ڈر،اندیشہ،ہول،(آنا،کرنا،ہوناکے ساتھ)"[۱۵]

۱۵۔مہذب الغات: "ڈر،اندیشہ،ہول"۔[۱۶]

۱۶۔فرہنگ آصفیہ: "ڈر،اندیشہ،ہول،کھٹے،دہشت،ہراس،ہیبت"۔[۱۷]

۱۷۔فرہنگ عامرہ: "ڈر،ڈرنا،رعب،بذع،خشیہ،نہیب،ہراس،ترس"[۱۸]

۱۸۔اوکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری:

"FEAR:(الف)ڈر،خوف،دھڑکا،اذیت وغیرہ کا،(ب)چوکنا پن،ہراس،خطرہ، خدشہ،فطری خدشہ۔[۱۹]

۱۹۔قومی انگریزی لغت: خوف(Fear)۔

"ترس،خطر،خوف،دردناک داخلی کیفیت جو کسی برائی یامنڈلاتے ہوئے خطرے کے خیال سے پیدا ہو جائے،اضطراب،فکر مندی،خدا کا خوف اور تقوی،ڈر،ہول، دہشت،ہراس۔(فعل متعدی)خوف محسوس کرنایاکسی شے کے دردناک اندیشے سے ڈرنا،خوفزدہ کرنا،شک کرنا۔(فعل لازم)کسی کے تقدس کے رعب میں ہونا،خوف زدہ ہونا،ہولنا"۔[۲۰]

۲۰۔کشاف اصطلاحاتِ نفسیات:

خوف(Fear):

"کسی خطرناک یاضرررساں ہیجاتی صورت حال کا سامنا ہونے سے پیدا ہونے والی ہیجانی کیفیت جو فرد میں اس صورت حال سے فرار حاصل کرنے کی تحریک پیدا کرتی ہے"۔[۲۱]

۲۱۔ فرہنگ نفسیات: خوف کی کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے

"فرار کی جبلت کے ساتھ ہی خوف کا ہیجان بھی ہمیں فطرت کی طرف سے ودیعت ہوا ہے۔ خوف کا ہیجان خوفناک ماحول میں ابھرتا ہے۔ اس میں جسمانی علامات قابل ذکر ہیں۔ مثلاً جسم کا لرزہ اور کپکی، نبض اور دل کی حرکات میں تیزی، سانس کا رکنا، مبہوت سا ہو جانا اور رونگھٹے کھڑے ہونا"۔ (۲۲)

i. جبر کی معنوی جہات: سماجی تناظر میں

جبر یا جبریت کے لیے انگریزی اصطلاح Determinism استعمال ہوتی ہے۔ جبریت اور عدم جبریت کا موضوع عرصۂ قدیم سے زیر بحث رہا ہے۔ جبر کی معنوی جہات وہی ہیں جو لغوی طور پر بیان کی گئی ہیں، البتہ اس کے دائرہ کار اور تفاعل سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جبریت ایک ایسا زاویہ یا تصور ہے جس کے مطابق انسان اپنے ارادے، اعمال اور افعال میں آزاد نہیں۔ اس نظریے کے تحت انسانی ارادے کی باگ ڈور کسی اور طاقت یا اتھارٹی کے ہاتھ میں ہے۔ طاقت اور اتھارٹی جو حتمیت کو فروغ دیتی ہے۔ کسی شے، فکر یا خیال کا حتمی ہونا گویا جبر کو فروغ دینے یا مجبور کرنے کے مترادف ہے۔ جیسا کہ عقل انسان کو مجبور کرتی ہے۔ اچھے برے یا غلط صحیح کی تمیز دیتی ہے۔ یہ تمیز یا امتیاز بھی جبر سے متصف ہے۔ ایک شے کا کسی دوسری شے کی نسبت سے پروان چڑھنا یا بالفعل ہونا بھی جبر کا ایک رویہ ہے۔ جیسا کہ نیکیوں کے بدلے گناہ سے بچنا یا گناہ کے بدلے نیکیاں کرنا یہ بھی ایک طرح کا الہامی جبر ہے۔ جس کا تعلق مذہب سے ہے۔ جو سماج کا ایک نمائندہ رکن ہے۔ اور انسان اس سماج کا نمائندہ ہے، جس کی پیدائش ایک حیاتیاتی عمل ہے اور اس عمل میں وہ بے بس ہے۔ اس تسلسل سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انسان کی جبریت اس کی پیدائش سے شروع ہو جاتی ہے اور یوں انسان آج بھی مجبورِ محض ہے۔

ایک طرف جبریت ہے تو دوسری طرف اس کے مقابل اصطلاح اختیاریت ہے۔ اختیاریت کا تعلق طاقت، اتھارٹی یا حتمیت کے بجائے انتخاب کی آزادی سے ہے اس لیے جبریت کو اختیاریت کی ضد تصور کیا جاتا ہے۔ اختیاریت عدم جبریت سے متصف ہے۔ جبریت اور عدم جبریت کے حوالے سے تین بنیادی عقائد سامنے آتے ہیں۔ (۱) ہر شے جبر کا شکار ہے (۲) جبر اور اختیار دونوں اثر انداز ہوتے ہیں (۳) جبر کی کوئی

حیثیت نہیں۔ پہلے دو عقائد نے انسانی فکر کو الجھائے رکھا اور تیسرے عقیدے نے انسانی فکری عقیدے کی شکل اختیار کر لی۔ جسے بعد میں کبھی ایمان، تو کبھی شعور اور کبھی انسان مرکزیت اور کبھی لامرکزیت کبھی عقل کی اتھارٹی تو کبھی اس کی نفی سے متصور کیا گیا۔ جبریہ پسند فلاسفر کہتے ہیں کہ انسانی زندگی کا کوئی عمل / واقعہ آزادانہ طور پر پیش نہیں آتا بلکہ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ کارفرما ہوتی ہے۔ جبریت علت و معلول کے قانون(The Law of cause and Effect سے وابستہ ہے۔

جبریت کی تفہیم Edward D Angelo کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> "What is determinism? Determinism has been defined in various ways. Some laymen and philosophers equate determinism with fatalism. To say that everything is determined mean that all events are beyond our control and that they will accrue in a fix manner, regardless of what we do".(23)

جبر کا عمومی تصور یہ ہے کہ انسان مکمل آزاد نہیں۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے یا ہوتا ہے وہ علت و معلول کے نتیجے سے ہے۔ "Everything that happens cause of happen" مختلف مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کا وجود جبری ہے۔ انسان کو اپنی پیدائش پر اختیار حاصل ہے اور نہ ہی انسان اپنے مرنے پر قادر ہے۔ جبریت کے حامی مفکرین کہتے ہیں کہ علت و معلول کے تناظر میں آزادی بھی ایک قسم کی جبر کی ہی صورت ہے۔ واقعہ کی علت کا معلوم نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ اس واقعے کی کوئی علت ہی نہیں۔ انسان مجبورِ محض ہے۔ قدیم زندگی سے جدید زندگی تک کا سفر صدیوں پر محیط ہے۔ یہ ارتقائی عمل علت و معلول کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ فلسفہ جبر میں انسان کا ارادہ مخفی قوت کے تابع ہوتا ہے۔ انسان بے بس ہے۔ انسان اپنے اعمال و افعال پر قادر نہیں۔ انسانی زندگی کا ہر عمل مشروط ہے۔ کسی نا کسی گزشتہ واقعہ کا نتیجہ ہے۔ مادی دنیا میں انسان آزادی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ جیسے ایک مشین خاص قوت کی مرہون منت ہوتی ہے ایسے ہی انسان بھی پابند ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق لکھتے ہیں:

"اسی نظریہ مادیت پر مبنی نظریہ جبریت کی رو سے کسی ایک معین وقت پر مادی دنیا بشمول نفسِ انسانی کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ اس کی کیفیت سے پہلے کی قوتوں کے امتزاج اور تقسیم کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے، اس مادی دنیا کی کائینات میں نا کوئی نیا عنصر یا نئی قوت (جس میں ارادہ بھی شامل ہے) وجود میں آتی ہے (اور نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے) اور نہ اس قسم کا کوئی خارج سے کائنات میں داخل ہوتی ہے۔ اس لئے ہم جس چیز کا نام ایک 'نیا عنصر' رکھتے ہیں وہ موجودہ قوتوں کی ایک نئی ترتیب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مادیت کے اس ادعا کو جبریت (Determinism) کہتے ہیں۔ اور اس میکانکی تصور کی رو سے مادی دنیا کے تمام افعال علت و معلول کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، لہذا متعین ہیں"۔ [۲۴]

سائنس نے بھی انسان کو مجبورِ محض کا درجہ دیا ہے۔ سائنس انسان کے جسمانی و نفسیاتی تقاضوں کو عقلی و سائنسی قوتوں کی تابع سمجھتی ہے۔ سائنسی رو سے ماحول کا انسانی زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ماحولیاتی تغیر و تبدل انسانی کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی ماحولیاتی اثرات جذب کر لیتا ہے۔ نسلی اور وراثتی جبریت کا ذکر آگے نفسیاتی معنویت میں آئے گا۔ نظریہ جبریت میں ہر عمل کے پیچھے کسی طاقت کا عمل دخل ہے۔

"And the extraordinary success of science in finding explanation makes it almost impossible to doubt determinism. Biology tells us that heredity determines what kind of persons we will be. Sociology tells us that environmental factors determine much of what we do". [25]

اس اقتباس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جبریت انسانی ارادے کی آزادی کی قائل نہیں، بلکہ ارادہ بلحاظِ علت کی توضیح پیش کرتی ہے۔ جبریت میں انسانی اعمال و افعال آزاد ارادے کے محتاج نہیں بلکہ اندرونی و بیرونی طاقت کی بدولت سرزد ہوتے ہیں۔ انسان کا حال اس کے ماضی سے جڑا ہوا ہے۔ انسانی زندگی کے پس منظر میں ایسے حالات ہوتے ہیں جو موجودہ واقعات کا سبب بنتے ہیں۔ ول ڈیورنٹ لکھتے ہیں:

" انسانی کردار، انسان کی شخصیت اور اس کے ماحول کا نتیجہ ہے جو عمل کے لئے اسے میسر آتا ہے۔ اس کی شخصیت، اس کی وراثت اور اس کے ماحول کا نتیجہ ہے۔ ہم وراثت کی زنجیر کا آخری سرا ہیں۔ ہم کسی چیز کی ابتدا نہیں کرتے، ہم کسی بات کا فیصلہ نہیں کرتے، ہم ان خارجی طاقتوں سے جن پر ہمارا کوئی اثر نہیں مجبور اور متاثر ہوتے ہیں۔ انتخاب فریب نظر ہے یہ محض جبر کی طاقتوں کا امتزاج ہے۔ انسان اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں کیونکہ وہ اپنے ارادوں اور اپنی آرزوؤں کا شعور رکھتے ہیں۔ لیکن ان اسباب سے بے خبر ہوتے ہیں جن سے ان آرزوؤں اور ارادوں کی تخلیق ہوتی ہے "۔(۲۶)

درج بالا اقتباس کے مطابق بھی انسان نسلی اور ماحولیاتی نظام میں مقید ہے۔ شکل وصورت، عادات، خوراک، رہن سہن کے طریقے، آواز اور کردار اس کے ماحول اور وراثت کی بدولت منتقل ہوتے ہیں۔ انسان فطری قوانین کا پابند ہے۔ سونا، جاگنا، رفع حاجت، مباشرتی تقاضے یہ سب فطری عوامل ہیں جن کی پابندی ہر انسان پر لازم ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کر سکتا کہ وہ پوری عمر جاگ کر گزارے۔ بوڑھا ہونا کوئی نہیں چاہتا لیکن بڑھاپا حقیقت ہے۔ ہکسلے کہتا ہے کہ انسان اپنی خواہشات پر عمل کرنے میں تو آزاد ہے لیکن خواہشات کے انتخاب پر اختیار نہیں رکھتا(۲۷) لیکن عدم جبریت کے پیروکار اپنے آباواجداد اور حالات کی بجائے خود کو انقلابی طاقت کا درجہ دیتے ہیں۔

> "In the context of the controversy over free will, determinism is equated with the concepts of causation and predictability. Determinism, in the sense, is the view that every event has a cause and is in principal predictable".(28)

جبر ایسی صورتحال ہے جو کئی تناظرات کے علاوہ سماجی ماحول سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے تناظر میں جبر معنوی طور پر سماج میں مختلف انداز میں سرایت کر جاتا ہے۔ سماج مختلف اقوام، زبانوں اور پیشوں سے منسلک لوگوں کا گروہ ہے جن کی آپس میں گہری وابستگی ہوتی ہے۔ سماج مختلف اداروں پر مشتمل

ہوتا ہے مثلاً خاندانی ادارے، مذہبی ادارے، معاشی ادارے، سیاسی ادارے، تعلیمی ادارے وغیرہ، جدید دور میں میڈیا کو بھی سماجی ادارہ تصور کیا جاتا ہے۔ ان سماجی اداروں میں انسان کے مختلف رتبے اور حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ہر طبقہ فکر کے لوگ سماج میں ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ سماجی ادارے سماج کے ستون کا درجہ رکھتے ہیں۔ڈاکٹر سی۔اے قادر سماجی اداروں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> " ان اداروں کا منشاء افراد اور گروہوں کے رشتوں کو منظم و مربوط کرنا ہے، اسی لئے سماجی ادروں کے ذریعے سے کسی گروہ کے طرز بود وباش، اس کے رسم ورواج، اور طور طریقوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہ طور طریقے مسلم ہوتے ہیں اور بعض اوقات غور وفکر کے بعد اختیار کیے جاتے ہیں "۔ (۲۹)

سماج میں خاندان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خاندان سے انسان کی افزائش، تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، ہر خاندان اپنی روایات کا حامل ہوتا ہے، سماج میں بعض خاندانوں کے رسم ورواج، رہن سہن وغیرہ ایک جیسے جبکہ بعض ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ سماج میں افراد اپنی خاندانی روایات کے پابند ہوتے ہیں اور ان سے انحراف سخت ممنوع ہوتا ہے۔ ان خاندانی روایات کی پاسداری میں خاندانی جبر کی صورتحال سامنے آتی ہے۔ فرد کی جبریت گھر سے شروع ہو جاتی ہے۔ بقول پاؤلو فریرے "جبر کے حالات غیر انسانی فضا کو قائم کرتے ہیں۔ وہ سماجی کلیت کو بھی غیر انسانی بناتے ہیں جو جابروں اور مظلوموں دونوں کو متاثر کرتی ہے"۔ (۳۰)

مذہب سماج کے بنیادی ستونوں میں سے ایک ہے۔ ارتقائی عمل میں مذہب ہر دور میں رہا ہے۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ مذاہب بھی بدلتے رہے۔ ایک مذہب کئی مسالک میں تقسیم ہوتا رہا۔ مذہب سے عقیدت انسان کا فطری عمل ہے۔ اس عقیدت کے پیش نظر انسان اپنے مذہب کے بارے بہت سنجیدہ اور جذباتی رویے کا حامل ہوتا ہے۔ یہ جذباتی رویہ بین المذاہب اور بین المسالک تفریق میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ آباؤ اجداد کے مذہب پر قائم رہنا ہی اپنے مذہب کے ساتھ اصل عقیدت کا درجہ سمجھا جاتا ہے۔ مولوی، پادری یا پنڈت سب اپنے اپنے عقیدے کی تبلیغ کرتے ہیں اور اس طرح مذہبی فرقہ وارانیت اور تعصب جنم لیتا ہے۔ مذہبی گروہ بندیاں سماجی جبر کو فروغ دیتی ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں

"ریاست کے مذہبی ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ریاستی اداروں اور مذہبی طبقوں کی جانب سے معاشرے میں لوگوں کے خیالات اور افکار اور سماجی سرگرمیوں پر پابندی لگائی جانے لگیں مثلاً ڈرامہ، موسیقی، رقص، مجسمہ تراشی اور دوسرے فنون لطیفہ ان قدغنوں کی وجہ سے اپنے فن میں اضافہ نہیں کر سکے۔۔۔ جب کسی سوسائٹی سے فنون لطیفہ کا خاتمہ ہو جائے تو اس صورت میں لوگوں کا احساس جمالیات ختم ہو جاتا ہے اور انسانیت کے وہ حساس جذبات یہ سماجی سرگرمیاں پیدا کرتی ہیں، یہ ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ تشدد، جبر، غصہ اور سختی لے لیتی ہیں"۔[۳۱]

سماج میں کچھ ادارے ایسے ہوتے ہیں جہاں انسان اختیاری طور پر کام کرتا ہے لیکن کچھ اداروں میں اسے جبراً کام کرنا پڑتا ہے۔ روزگار کے حصول کے لئے اپنی مرضی کے خلاف کام کرنا مجبوری بن جاتا ہے کیونکہ پورا کنبہ اس کی کفالت میں ہوتا ہے۔ڈاکٹر مبارک رقمطراز ہیں کہ:

" ستم ظریفی یہ ہے کہ جن لوگوں نے مزدوروں اور محنت کشوں کی محنت سے دولت اکٹھی کی وہ تو سماج میں قابل احترام اور باعزت کہلائے، مگر جن کا استحصال ہوا، جنہوں نے غربت و مفلسی میں زندگی گذرای، دکھ اٹھائے اور تکلیف سہی، وہ لوگ کم تر اور ذلیل ٹھہرے"۔[۳۲]

سماج کی بہتری معاشی ترقی سے وابستہ ہے۔ طبقاتی تقسیم نے امیر اور غریب میں لکیر کھینچ دی ہے۔ معاشی عدم استحکام سے غریب کیسے جبراً زندگی گزار رہا ہوتا ہے اسے لینن نے یوں لکھا کہ

" غذائی اشیاء، کپڑے ایندھن، کرایہ اور مکان، سب کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ مزدور قطعی طور پر مفلس ہو رہا ہے یعنی پہلے سے زیادہ غریب ہو گیا ہے، بدتر حالت میں رہنے پر، بدتر کھانے پر، بھوک سے زیادہ پریشان رہنے پر اور تہہ خانوں اور کوٹھڑیوں میں رہنے پر مجبور ہے"۔[۳۳]

سماج میں سیاست کا بہت عمل دخل ہے۔ سیاسی استحکام معاشرے کی بہتری میں اہم کردار ادا کرتا ہے ۔ پاکستان میں سیاست رفاہ عامہ کی بجائے ذاتی مفاد کے لئے کی جاتی ہے۔ متعدد بار مارشل لا نے جمہوری نظام کو مفلوج کر دیا۔ جس کی وجہ سے سماج میں جبریت کو فروغ ملا۔ حکومتیں عوامی فلاح و بہبود کے لئے صحیح معنوں

میں توجہ نہیں دیتیں، یہی وجہ ہے کہ سالہا سال لوگ ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور گلیوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ حکومت کے بے جا لگائے جانے والے ٹیکس عوام مجبوراً ادا کرتے ہیں۔

ہر سماج میں مخصوص تہذیب و تمدن اور ثقافتی اقدار پائی جاتی ہیں۔ فرد کی طرزِ زندگی ان اقدار کی پابند ہوتی ہے۔ حالات و واقعات سے کلچر میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے، بدلاؤ کی صورتحال کو زبردستی قبول کرنے کا نام جبر ہے۔

ii. جبر کی معنوی جہات: نفسیاتی تناظر میں

گزشتہ دو صدیوں سے علمِ نفسیات میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے۔ نفسیات انسان کی داخلی زندگی کی عکاس ہے۔ نفسیات دانوں نے انسان کے داخلی کھوج میں اہم پیش رفت کی۔ نفسیات سائنسی بنیادوں پر انسانی ذہنی ساخت کا مطالعہ کرتی ہے۔ نفسیات میں جبریت کو مختلف زاویوں سے دیکھا جاتا ہے۔ نفسیاتی جبر کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۱۔ جینیاتی جبریت (Genetic Determinism) ۲۔ شعور / لاشعور کا جبر (Conscious/ Unconscious Determinism)۔ ۳۔ جبلی جبریت (Instinct Determinism)

جینیاتی جبر (Genetic Determinism) جسے سائنسی اصطلاح میں (Biological Determinism) بھی کہا جاتا ہے، انسان کی ساخت سے بحث کرتی ہے۔ جینز نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں انسانی رنگت، قدامت، آواز اور دیگر اعضا میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ جینز کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ انسان اپنی نسل کو اسی تسلسل سے بڑھانے پر مجبور ہے۔ نفسیات میں بھی جینز کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ انسانی کردار میں جینز کا بہت عمل دخل ہے۔ انسان جنیز کی بدولت اپنے والدین سے وراثت میں بہت سی چیزیں حاصل کرتے ہیں۔ قاضی قیصر الاسلام لکھتے ہیں:

> "ارادی فعل (voluntary Action) کا نفسیاتی تجزیہ ظاہر کرتا ہے
> کہ انسانی ارادہ آزاد نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعین اس محرک سے ہوتا ہے جو کسی
> مخصوص صورت حال میں سب سے زیادہ قوی ہو"۔ [۳۴]

سیگمنڈ فرائڈ جسے بابائے نفسیات کہا جاتا ہے، نے انسان کے شعور کی گتھیاں سلجھانے کا عملی مظاہرہ کیا اور " نظریہ تحلیل نفسی " پیش کیا۔ فرائڈ نے انسان کے بادی النظر کے ساتھ اندرونی ساخت سے پردہ اٹھایا اور اپنے مشاہدات کئے۔ فرد کے خارجی عوامل کے ساتھ زیادہ توجہ داخلی عوامل پر دی، جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ نفسیاتی علم فرد کے داخلی احساسات، جذبات اور محرکات کے مطالعہ کا نام ہے۔ اس سے انسان کی ذہنی وفکری سطح تک رسائی حاصل کی جاتی ہے جس سے انسانی نفسیاتی مسائل، ان کے طور اطوار، سماج میں ان کے رویے، عوامل اور تفاعل کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ فرائڈ نے انسانی رویوں، سلوک اور ذہنی امنگوں کو سائنسی بنیادوں پر پرکھا، اس سے قبل یہ تصورات صرف مذہبی اور اخلاقی درجے تک محیط تھے۔

فرائڈ نے انسانی شعور کی تہہ داریوں کو نئے انداز میں سمجھنے کی کامیاب کوشش کی۔ فرائڈ کا بڑا کارنامہ لاشعور سے متعلق پیش رفت ہے۔ فرائڈ یہ سوچتا تھا کہ انسان بچپن سے بہت سی خواہشات کو کہیں دبا دیتا ہے۔ بہت سے واقعات ذہن سے روپوش ہو جاتے ہیں اور پھر اچانک یاد آجاتے ہیں، وہ استفہامیہ انداز اختیار کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ یاد آنے سے قبل یہ واقعات کہاں دبے ہوتے ہیں؟ اس کے لئے فرائڈ نے لاشعور کا نظریہ پیش کیا۔ فرائڈ نے شعور کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ شعور، تحت الشعور اور لاشعور۔ شعور انسان کی حاضر یاداشتیں ہیں۔ تحت الشعور درمیانی سطح ہے جہاں عارضی طور پر خواہشات موجود ہوتی ہیں اور ضرورت پڑنے پر سامنے آجاتی ہیں جبکہ تیسرا حصہ لاشعور ہے جہاں خواہشات / واقعات درجہ بدرجہ محفوظ ہوتے رہتے ہیں۔ بقول شیر محمد اختر:

> " دباؤ کے ذریعے قدیمی ہیجانات، احساسات اور خیالات متواتر دبتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے ہیجانات، احساسات اور خیالات لے لیتے ہیں جو فرد کی خارجی اور داخلی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ قبل الذکر دب جاتے ہیں سنتے نہیں اور موقع پا کر معمولی اور بھیانک خوابوں واہمہ (Tantasy) دیوانگی اور ہذیان ایسی صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں"۔ (۳۵)

فرائڈ شخصیت کی ساخت کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اڈ، ایگو (انا) اور سپر ایگو (فوق الانا) یہ تینوں حصے انسان کی شخصیت کو متوازن رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے انسان مختلف کام سرانجام دیتا ہے۔ اڈ مکمل طور پر لاشعو سے وابستہ ہے۔ یہ جبلت کی آماجگاہ بھی ہے۔ اڈ داخلی قوت ہے جو انسان کو جبراً متحرک کرنے پر

زور دیتی ہے۔ اڈ کو تخریبی یا تعمیری نتائج سے غرض نہیں ہوتی بلکہ یہ اپنی تسکین کے لئے ہر راستہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔ اڈ کے بعد ایگو (انا) ہے۔ ایگو ایسی قوت ہے جو اڈ کا راستہ روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور اڈ کی ہٹ دھرمی کو قابو کر کے خواہشات کی تکمیل کے لئے اعتدال کا راستہ نکالتی ہے۔ ایگو اچھے اور برے میں سے کسی بھی طریقے کو اپنا کر حل پیش کرتی ہے لیکن یہ اڈ کی نسبت کم نقصان دہ ہوتا ہے۔ تیسرے نمبر پر سپر ایگو ہے۔ فرائڈ کہتا ہے کہ سپر ایگو ایسی طاقت ہے جو انسان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کراتی ہے اور صرف تعمیری راستہ دکھاتی ہے۔ سپر ایگو انسان کو اخلاقی، مذہبی اور ریاستی قانون کے دائرے میں رہ کر خواہشات کی تکمیل پر مجبور کرتی ہے۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات میں نفسیاتی جبریت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> "لاشعوری عوامل انسان کی زندگی پر حکمرانی کرتے ہیں۔ فرد ان کے ہاتھوں ایک کھلونا ہے۔ نفسیات کا دعویٰ ہے کہ شخصیت کی بنیاد بچپن ہی میں پہلے پانچ سال میں پڑ جاتی ہے۔ یہ بھی جبریت ہے۔ ایڈلر کا یہ کہنا کہ ہر بچہ اپنی ترتیب پیدائش کے باعث کسی نہ کسی الجھن اور دقت سے دوچار ہوتا ہے۔ جبریت پر ہی منتج ہوتا ہے"۔ [۳۶]

علمِ نفسیات میں جبلت ایک اہم موضوع ہے۔ جو نفسیاتی جبریت کا باعث بنتی ہے۔ انسان میں بہت سی جبلتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ انسان سے انسان میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ جبلت ایک ایسی قوت ہے جو انسان کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ انسانی کردار میں جبلت کا بہت عمل دخل ہے۔

فرائڈ نے نظریہ تحلیل نفسی میں جبلت کے جبر پر بھی بحث کی ہے کہ جبلت کی جبری صورتحال کیسے فرد کی آسودگی کا باعث بنتی ہے۔ فرائڈ دو قسم کی جبلت کا ذکر کرتا ہے، ایک جبلت حیات اور دوسری جبلت مرگ۔ فرائڈ کے نزدیک جبلت حیات انسان کو زندگی کی روشنی سے آشنا کراتی ہے، انسان میں زندہ رہنے کی جستجو پیدا ہوتی ہے۔ جبلت مرگ انسان کو زندگی ختم کرنے کی طرف راغب کرتی ہے اور انسان کو لڑائی جھگڑے پر اکساتی ہے۔ ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں کہ

> "جبلت مرگ انسان کو موت کی طرف بڑھاتی ہے۔ یہ جبلت جب زور پکڑتی ہے تو انسان لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ قتل و غارت، لوٹ مار، گالی گلوچ، نفرت اور

اسی طرح کے دوسرے انسانی اعمال اسی جبلت کے تابع ہیں۔ یہی جبلت جب قوموں میں زور پکڑتی ہے تو وہ جنگیں لڑتی ہیں"۔ (۳۷)

جبلی طاقت کے سامنے انسان مجبور ہو جاتا ہے، جیسا کہ مامتا کی جبلت ماں کو شفقت اور مہربان رہنے پر مجبور کرتی ہے اور متشدد رویہ اپنانے سے روکتی ہے۔ مامتا کی جبلی تسکین صرف اولاد سے محبت اور شفقت کی بدولت ممکن ہے۔ ڈاکٹر نعیم احمد جبلت کی جبری صورتحال کو یوں بیان کرتے ہیں:

"ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جبلت کا اصل وظیفہ عضویہ کو حالت اطناب سے واپس حالت سکون میں لانا ہے۔ عضویہ میں چونکہ بار بار احتیاجات پیدا ہوتی ہیں اس لئے جبلت بار بار اطناب اور کھچاؤ سے عضویہ کو حالت سکون میں لاتی ہے یہ بار بار کا عمل فرائڈ کی اصطلاح میں "تکراری جبر "(Repetition Compulsion) کہلاتا ہے۔ مثلاً دن بھر کی تھکن کے بعد رات کی نیند، دن میں تین بار کھانا کھانا یا وظیفہ زوجیت کی ادائیگی"۔ (۳۸)

نفسیاتی تناظر میں عادات کا جبر بھی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ عادات کا جبر لاشعوری ہوتا ہے۔ انسان لاشعوری طور پر اپنی عادات سر انجام دیتا رہتا ہے۔ سماجی جبر میں خارجی عوامل شامل ہوتے ہیں اس میں انسان خود بے قصور ہوتا ہے لیکن نفسیاتی جبر میں انسان خود ایسی صورت حال پیدا کر لیتا ہے جو اندر ہی اندر دیمک کی طرح کھائے جاتی ہے۔ اس صورت حال سے انسانی ذہنی و فکری صلاحیتیں متاثر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ خواہشات کی تسکین انسان کو نفسیاتی مریض بنا دیتی ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تسکین کا راستہ اڈ، ایگو اور سپر ایگو طے کرتی ہیں، یہ طاقتیں انسان کے حرکی نظام میں بھونچال برپا کر دیتی ہیں، انسان ان طاقتوں کے بھنور میں گھومتا رہتا ہے، اگر ان میں توازن بر قرار نا رہے تو فرد بہت سی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے مثلاً جبریت، تشویش، گھبراہٹ، ذہنی تناؤ، اعصابی نظام کی کمزوری، افسردگی، خوف اور گھبراہٹ وغیرہ۔

نفسیاتی جبر انسان کو اعصابی بیماریوں میں مبتلا کر دیتا ہے کیونکہ نفسیات کا تعلق انسان کے ذہن سے ہے اور اگر انسان ذہنی نا آسودگی کا شکار ہو گا تو دماغ کلی طور پر کام نہیں کرے گا جس سے انسانی جسم میں مختلف قسم کی بیماریاں جنم لینے لگتی ہیں۔

نفسیاتی جبر جب شدید نوعیت کا ہو تو انسان عدم برداشت کا شکار ہو جاتا ہے جو کسی بھی وقت نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ بعض افراد شعوری طور پر جبر کا شکار ہوتے ہیں، اور سستی اور کاہلی جیسی کیفیات میں خود کو مبتلا رکھتے ہیں، ایسے افراد زیادہ محنت کرنے سے کتراتے ہیں، حالانکہ وہ جسمانی طور پر بہت صحت مند ہوتے ہیں۔

کارل گستاف ژونگ فرائڈ کے اولین پیروکاروں میں تھا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ژونگ نے فرائڈ کے نظریات سے اختلاف کیا اور اپنے نظریات پیش کئے۔ ژونگ کے نزدیک جنسی طاقت (لیبیدو) سب کچھ نہیں ہے جبکہ فرائڈ فرد کے ہر عمل کے پیچھے لیبیدو کو اہمیت دیتا ہے۔ ژونگ اجتماعی لاشعور(collective unconsiosness) کا نظریہ بیان کرتا ہے کہ بچہ جسمانی و نفسیاتی خصوصیات وراثت میں لے کر آتا ہے۔ ژونگ کے نزدیک اجتماعی لاشعور ہر انسان میں پایا جاتا ہے جو انسانی ارتقا کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ ژونگ انسانی شخصیت کو چار حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ (۱) حاکمیت پسند (Ruling Type) ، (۲) انحصار پسند (Learning type)،(۳) احتراز پسند(Avioding type)،(۴)۔ سماجی مددگار(Socialy useful Type)۔ پہلی قسم میں ژونگ ایسے لوگوں کو شمار کرتا ہے جو خود کو حاکم بننے پر زور دیتے ہیں۔ ایسے افراد دیگر افراد کو کمتر تصور کرتے ہیں۔ دوسری قسم میں ایسے افراد شامل ہیں جو خود کی بجائے دوسروں پر انحصار کرتے ہیں۔ ہر کام اور مشکل میں لوگوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ دوسروں کی رائے پر چلتے ہیں۔ تیسری قسم میں ایسے افراد شامل ہیں جو اپنی الگ دنیا بسائے ہوتے ہیں۔ انہیں دوسروں کی زندگی سے سروکار نہیں ہوتا۔ وہ حقیقتوں اور سچائیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی دنیا میں مست رہتے ہیں۔ چوتھی قسم کے افراد مثبت رویوں کے حامل ہوتے ہیں۔ لوگوں کی مدد کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ژونگ کہتا ہے کہ چاروں قسم کے لوگ اپنی ذات کو اسی دائرے میں محدود رکھتے ہیں۔

ژونگ اجتماعی لاشعور کی بنیاد پر چند آرکی ٹائپ سے وضاحت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان زندگی میں بہت سے معاملات اپنے اباواجداد سے اخذ کرتا ہے۔ یہ نظریات بھی ہو سکتے ہیں اور عادات بھی۔ انسانی طرز زندگی پر پہلے سے موجود عناصر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ژونگ انسانی کرداروں کے حوالے سے ایک آرکی ٹائپ پرسونا(persona) کی وضاحت کرتا ہے، یہ ایک نقاب(mask) ہے جو ہر انسان نے لگایا ہوا ہے۔ انسان

مختلف جگہوں پر اپنا ماسک تبدیل کرتا رہتا ہے اور یہ اس کی مجبوری ہے۔ انسان ہر جگہ ایک رویے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وقت اور مقام کی تبدیلی پر سونا کی تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ شہزاد احمد لکھتے ہیں:

> "پرسونا' بہر حال ایک ضرورت ہے، اس کے ذریعے ہم دنیا سے تعلق پیدا کرتے ہیں، یہ ہمارے تعلق کو آسان بنا دیتی ہے۔ کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگوں سے کیا توقعات وابستہ کرنا چاہیں اور مجموعی طور پر یہ ان کو قابلِ قبول بناتا ہے جس طرح اچھا لباس بد صورت بدن کو بہتر بنا دیتا ہے"۔ (۳۹)

دوسرا آرکی ٹائپ سایہ / پرچھائی (shadow) ہے۔ جو پرسونا کا متضاد ہے۔ ژونگ کے نزدیک سایہ لاشعور کا حصہ ہے۔ انسان جو نظر آتا ہے اس کے پیچھے ایک اور انسان بھی ہوتا ہے۔ جو لاشعوری طور پر انسان کی پشت پناہی کرتا رہتا ہے۔ یہ منفی خصوصیات کی آماجگاہ ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> "یہ ہماری ان تمام خواہشوں اور ہیجانات کا مجموعہ ہے جنہیں ہم ناجائز سمجھتے ہوئے ذاتی لاشعور میں دھکیل دیتے ہیں اور یہ کیونکہ لاشعوری ہے اس لئے کسی ذریعہ سے بھی اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے یہ انسان میں جبلی اور خلقی ہے"۔ (۴۰)

ژونگ کہتا ہے کہ سایہ چونکہ منفی خواہشات ہوتی ہیں، فرد کے لئے ضروری ہے کہ ایسی خواہشات کا جزوی اظہار کرتا رہے تاکہ ان کے دباؤ میں کمی ہو۔ اگر ان کو کلی طور پر دبا دیا جائے تو جبریت کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور جب اظہار ہو گا تو اس کے نتائج زیادہ خطرناک ہوں گے۔ یہ اظہار انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر ہو سکتا ہے۔

iii. خوف کی معنوی جہات: سماجی تناظر میں

خوف ایک ایسی ذہنی کیفیت ہے جو کسی نقصان یا خطرے کے پیشِ نظر ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں عدم تحفظ کا گماں ہوتا ہے۔ انسان خود کو محفوظ رکھنے کی فکر کرتا ہے۔ خوف کا عنصر انسانی زندگی کے ساتھ ہمیشہ سے موجود ہے یا یوں کہا جائے کہ خوف انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ خارجی تناظرات انسان کو ایسے ہول میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ انسان فرار کی راہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ کسی بھی انجانے نقصان کا خطرہ انسان کو سماجی و نفسیاتی ہر دو سطح پر غیر محفوظ بنا دیتا ہے۔

بے یقینی فرد میں خوف پیدا کرتی ہے جو رویوں کی تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ سماجی ماحول فرد کی زندگی پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ جدید دور میں فرد میکانکی کی زندگی گزار رہا ہے، ہر طرف افراتفری کا عالم ہے۔ اس دور میں سماجی مسائل نے انسان کو خوفزدہ کر دیا ہے۔ فرد کسی نا کسی خوف سے دوچار ہے۔ معاشرہ کی بدلتی ہوئی حالت نے خوف کی فضا کو بڑھا دیا ہے۔ کسی کو اپنے بچوں کے اغوا کا خوف لاحق ہے تو کسی کو اپنی عصمتوں کی پامالی کا۔ کوئی دہشت گردی کے حصار میں بے موت مرے جانے کے خوف میں مبتلا ہے تو کوئی طاقت ور کی طاقت سے خوفزدہ۔ طاقت ور اپنی طاقت کے چھن جانے یا کمزور ہو جانے کا خوف لئے ہوئے ہے۔ امیر، غریب ہر طبقہ عدم تحفظ کا شکار ہے۔ امیر کو اپنی دولت کے ختم ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے اور غریب کو اپنی بقایا مفلسی کی زندگی گزارنے کا خوف۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش لکھتے ہیں:

> " آج کے دور میں چھڑ جانے والی جنگیں فرد کے لئے انتہائی جان لیوا بن چلی ہیں، اسی طرح نسلی اور فرقہ وارانہ فسادات کا خوف جان و مال کے بارے عدم تحفظ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بالخصوص بڑھتے ہوئے جرائم نے اس کا سکھ چین حرام کر دیا ہے۔ دن کو باہر نکلتے ہوئے بھی وہ ایک نادیدہ خوف کے گھیرے میں ہوتا ہے اور رات کو مقفل مکان میں مقید ہو کر بھی اس کو چین سے نیند نہیں آتی "۔
> (۴۱)

خوف کی مختلف جہتیں ہیں جو سماجی، نفسیاتی اور روحانی عوامل سے جڑی ہوتی ہیں۔ خوف کے مختلف درجے اور احوال ہیں، یہ شدید نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے اور سرسری بھی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسانوں کو آپس میں جوڑے بھی رکھتی ہے اور الگ بھی کرتی ہے۔ چونکہ سماج فرد سے فرد اور فرد گروہ سے وابستہ ہے لہذا انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خوف یکساں نوعیت کا پایا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کون سے سماجی حالات ہیں جو خوف پیدا کرتے ہیں، جن کی وجہ سے عدم اطمینان اور عدم تحفظ بڑھ رہا ہے۔ یہ حالات ہمیں سماجی تناظر میں خاندانی، تعلیمی، مذہبی، ریاستی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی سطح پر ملتے ہیں۔

خوف کے مختلف رنگ، روپ اور کوائف ہیں۔ خوف ایک ایسی حقیقی صورتحال کا نام ہے جو منفی بھی ہے اور مثبت بھی۔ مثبت حقائق تعمیری زندگی سے وابستہ ہیں جبکہ منفی حقائق تخریبی زندگی سے وابستہ ہیں۔

خوف پیدا کیسے ہو تا ہے ؟ یہ سماجی رویوں، حالات، فیصلوں اور قوتوں کے نتائج میں پیدا ہو تا ہے۔ سماجی عوامل براہ راست فرد کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، جس سے ہول و ہراس کی صورتحال پیدا ہوتی ہے۔

سماج میں خاندان کو خاصی اہمیت حاصل ہے، خاندانی رسوم ورواج کے نتائج نے فرد کو خوفزدہ کر دیا ہے۔ خاندانی جبر سے خوف پیدا ہو تا ہے۔ جبر اور خوف ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ معاشرتی ناہمواری نے انسانی زندگی مشکل بنادی ہے۔ دہشت گردی ، ٹارگٹ کلنگ، ڈاکازنی اور قتل و غارت نے ایسا ماحول بنادیا جس میں انسان محفوظ نہیں۔ اس غیر محفوظ ماحول میں انسان دہشت زدہ ہے۔ کسی وقت کوئی بھی حادثہ رونما ہو سکتا ہے اور جان جاسکتی ہے۔ اس غیر یقینی صورتحال میں ہر طبقہ اور شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد خطرے سے دوچار ہیں۔ دہشت زدہ ماحول انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کر رہا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی رقمطراز ہیں کہ

> " پاکستانی معاشرہ اس وقت جس بحران سے گزر رہا ہے اس میں زندگی کے مفہوم کو تلاش کرنا اور اس کو بامعنی بنانا مشکل نظر آتا ہے۔ ایک ایسی صورتحال کہ جہاں انسانوں کا قتل روزمرہ کا معمول ہو اور ہر فرد خوف اور دہشت کے ماحول میں سہا ہوا رہتا ہو اور جہاں موت کا خوف ذہنوں پر طاری ہو تو ایسے ماحول میں زندگی بے معنی ہو جاتی ہے"۔ (۴۲)

ہر شخص کا خوف اس کے تناظر سے وابستہ ہے،، لہذا خوف کا پہلو کسی نا کسی طرح انسانی زندگی میں ہر لمحہ موجود رہتا ہے۔ خوف کی زیادتی کے پیش نظر انسانی کی خارجی و داخلی حالت یکسر بدل جاتی ہے، خوفزدہ شخص ڈپریشن، تنہائی اور خاموشی اختیار کر لیتا ہے جو کہ سماجی روابط میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ سماج میں سیاسی گہما گہمی نے انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں کیوں کہ سماج اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سیاست سے وابستہ لوگ کسی نا کسی طرح خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ سیاست میں سب سے بنیادی مسئلہ ہار جیت کا ہے۔ ہار کا خوف ہر انسان کے ساتھ پیوست ہے۔ سیاسی قوتیں اپنی اجارہ داری کے لئے سماج میں ہراس پیدا کرتی ہیں۔

مذہبی انتہا پسندی کا خوف دور حاضر میں تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات نے سماجی ناہمواری اور خوف کو ہوا دی ہے۔ انسان انسان کا دشمن بن چکا ہے۔ بین المذاہب ہم آہنگی کے فقدان سے

مذہبی آزادی ختم ہو رہی ہے۔ ایسی صورتحال میں خوف کی کیفیات نے جنم لیا ہے۔ جس سے نفرت بڑھتی جا رہی ہے۔ مذہنی تعصبات کے نتیجے میں انسانی زندگی بے سکون ہو چکی ہے اور دہشت کی فضا قائم ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی رقمطراز ہیں

> "اگر کسی معاشرے میں مذہبی انتہا پسندی جڑ پکڑ لے، تو اس کی وجہ سے معاشرہ اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے، اور اس کی وجہ سے لوگ مختلف جماعتوں اور گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ نفرت، عناد اور دشمنی کی فضا میں ہر وقت فساد اور فتنہ کا خطرہ ہوتا ہے"۔(۴۳)

ریاست یا حکومت اپنی رعایا کو مختلف طریقوں سے خوفزدہ رکھتی ہے۔ جمہوری نظام میں مخالفین کو سیاسی انتقام کا نشانہ بنا کر خوفزدہ کیا جاتا ہے جبکہ آمریت اور بادشاہت میں رعایا کی جاسوسی کر کے اور سزائیں دے کر خوف اور دہشت کا ماحول بنایا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی بے سکون اور عدم اطمینان سے دوچار ہو جاتی ہے ۔ریاستی پابندیاں فرد کو کرب اور پریشانی میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں

> "جب بھی معاشرے میں خوف و ہراس کی فضا ہوتی ہے تو ایسے معاشرے میں تخلیقی صلاحتیوں کا زوال ہو جاتا ہے۔ آرٹ، ادب اور موسیقی بے جان ہو جاتی ہے۔ خوشامد کا کلچر پروان چڑھتا ہے، لوگوں میں مایوسی اور ناامیدی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، جو ترقی کی تمام راہوں کو بند کر دیتے ہیں۔ خوف و دہشت سے ایک آمر اپنے اقتدار کو تو طول دے سکتا ہے، مگر وہ ملک و قوم کو تباہ کر دیتا ہے"۔(۴۴)

ہمارے سماج میں دشمنی کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے، دشمن کا خوف ہر وقت انسان کو لاحق رہتا ہے۔ یہ دشمنیاں خاندانی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ دشمن ایک دوسرے سے بدلہ لینے کے تعاقب میں خوف کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ریاست یا ملک عالمی سطح پر بھی خوف کا شکار رہتی ہے۔ پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے جہاں معاشی نظام غیر مستحکم ہے۔ معاشی پالیسیاں اور عالمی اداروں کی طرف سے پابندیوں کا خوف منڈلاتا رہتا ہے۔ اندرونی و بیرونی سازشوں اور مخالف قوتوں کا خوف سماج پر اثرانداز ہوتا ہے۔ ملک دشمن عناصر کی تخریبی کاروائیاں ریاست میں خوف و دہشت کی فضا پیدا کرتی ہیں۔

خوف کے مثبت پہلوؤں پر نظر دوڑائی جائے تو یہ انسانی زندگی میں مثبت کردار ادا کرتے ہیں جیسا کہ قانوں کا خوف انسانی زندگی کو ہموار اور پر سکون رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر قانون کا خوف نا ہو تو معاشرے میں نظم وضبط بالکل بھی نا ہو۔ اللہ کا خوف نیکی اور بدی میں تمیز سیکھاتا ہے، موت کا خوف انسان کو دائمی حکمرانی اور اقتدار کے نشے کو ختم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

ii. خوف کی معنوی جہات: نفسیاتی تناظر میں

ماہرین نفسیات انسان کے خارجی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے داخلی حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں، داخل کی تہہ داریوں تک پہنچنے کا عمل نفسیاتی علم کی بدولت ممکن ہوا ہے۔ فرائڈ نے شعور، تحت الشعور اور لاشعور کے نظریات میں انسانی ذہنی کشمکش کو پہچاننے کی کامیاب کوشش کی۔ نظریہ تحلیل نفسی میں انسان کے داخل پر زور دیا گیا۔ فرائڈ کہتا ہے کہ انسانی رویے کے پیچھے مخفی طاقت ہوتی ہے جو انسانی زندگی پر اثرانداز ہوتی ہے۔ انسان میں نسل در نسل ایسے جینز منتقل ہو جاتے ہیں جن میں خوف کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ کچھ لوگ وراثتی طور پر مختلف قسم کے خوف میں مبتلا ہوتے ہیں ۔ خوف ایسی کیفیت ہے جو انسان کو نفسیاتی طور پر کمزور بناتی ہے۔ فرائڈ کہتا ہے کہ بچوں کو بچپن سے مختلف چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے جو ان کے لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں ۔ وہ خود بھی والد کے سخت رویے سے ایک عرصے تک خوفزدہ رہا۔

موت کا خوف پیدائش کے ساتھ ہی جنم لیتا ہے۔ اس خوف سے چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن ہے۔ انسان دنیا میں جتنی بھی ترقی کرلے موت کو مات نہیں دے سکتا۔ موت برحق ہے لیکن مرنا کوئی نہیں چاہتا۔ موت کا خوف انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ آئے روز ٹارگٹ کلنگ، قتل و غارت اور دھماکوں نے انسان کو بے وقت موت سے ڈرادیا ہے۔ نفسیاتی سطح پر موت کا خوف کسی پس منظر سے جڑا ہوتا ہے۔ والدین، اولاد یا کسی عزیز کے مرنے سے انسان نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

جدید معاشرے میں بہت سی پیچیدگیاں ہیں جن سے انسانی زندگی مشکل کا شکار ہے گھٹن زدہ ماحول، نفسانفسی، افراتفری اور میکانکی زندگی نے فرد کو الجھا کے رکھ دیا ہے۔ اس دہشت زدہ صورتحال میں انسان خود کو تنہائی، ڈپریشن، پژمردگی اور خوف وہراس میں مبتلا کر چکا ہے۔ علم نفسیات سے قبل خوف کی کیفیت کو

خارج سے منسلک کیا جاتا تھا لیکن نفسیاتی علوم نے داخل کے خوف کو اجاگر کیا جو ایک نفسیاتی مسئلے کو طور پر سامنے آیا ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"خوف جبلت اور جسم کے رد عمل کا قدیم ترین انداز ہے، لہذا اس سے قطعی فرار ناممکن ہے۔ عام مشاہدہ کے ساتھ یہ نفسیاتی حقیقت بھی ہے کہ خوف سے ڈر کر جتنا بھاگیں، خوف میں اتنا ہی اضافہ ہو گا۔۔۔خوف کی یہی بنیادی حقیقت ہے کہ اس میں اشیاء اپنی جسامت سے بڑھ کر نظر آتی ہیں اور اسی لئے زیادہ پریشان کن اور حواس باختہ کر دینے والی محسوس ہوتی ہیں"۔[۴۵]

فرائڈ کے پاس ایسے بہت سے مریض آیا کرتے جو نفسیاتی طور پر خوف کا شکار ہوتے، فرائڈ تحلیل نفسی کے ذریعے تہہ تک جانے کی کوشش کرتا اور معلوم کرتا کہ یہ مریض خوفزدہ کیوں ہیں۔ "فرائڈ کہتا ہے کہ ضروری نہیں کہ خوف صرف خارجی شے کا ہی ہو۔خوف کسی داخلی نفسی کیفیت سے بھی ابھر سکتا ہے"۔[۴۶]

انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے تگ و دو کرتا رہتا ہے۔اگر اسے رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑے تو وہ خود کو تنہا کرلیتا ہے جس کے نتیجے میں رشتوں، سماجی تعلقات اور معاشرتی میل جول میں فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان سب کے ہوتے ہوئے بھی انسان خود کو تنہا سمجھتا ہے۔ بعض اوقات انسان اپنوں سے دوری کی وجہ سے تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔اکثر لوگ گھر، بیوی بچوں، اولاد سے دور نہیں رہ سکتے۔اگر ایسا کرنا پڑ جائے تو تنہائی کے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

انسان کی زندگی کا مقصد مستقبل سنوارنا ہے، بہتر مستقبل ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے۔ زندگی کی الجھنیں انسان کے مستقبل میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ جس سے مستقبل کا خوف جنم لیتا ہے۔ دہشت زدہ ماحول میں انسان اپنی اور اپنے کنبے کے مستقبل کے خطرات سے دوچار ہو جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں آسودہ زندگی کے آثار کمزور پڑ جاتے ہیں۔انسان نفسیاتی کشمکش کا شکار رہتا ہے اور ہر وقت مستقبل کے خوف میں مبتلا رہتا ہے۔

اگر خوف حد سے بڑھ جائے تو وہ فوبیا کی صورت اختیار کرلیتا ہے، اس حالت میں انسان جس شے سے خائف ہوتا ہے اس کا ذکر ہوتے ہی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔اکثر ایسے واقعات سامنے آتے ہیں کہ بچوں کے سامنے

والدین کو مار دیا جاتا ہے، ایسی کوئی بھی بات اگر بچوں کے سامنے کی جائے تو وہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ بعض افراد کمزور دل ہوتے ہیں اور وہ چھوٹے چھوٹے معاملات کو بڑا سمجھ کر خائف رہتے ہیں۔ یہ افراد مختلف فوبیا میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ کوئی شخص بلندی پر چڑھنے سے خائف ہوتا ہے تو بلندی کا تصور بھی اس کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ سب نفسیاتی تناظر کی بابت ہوتا ہے۔

ج۔ جدید اردو افسانے میں جبر اور خوف کے عناصر: پس منظری مطالعہ

اردو افسانے کی ابتداء بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی۔ رومانویت کے سائے میں اردو افسانے کا سفر مارکسیت سے ہوتا ہوا ترقی پسند تحریک تک جا پہنچا۔ ابتدائی تین دہائیوں میں افسانے کے لئے ایسی زمین ہموار ہوئی کہ اس کی کامیاب فصل آج تک جاری ہے۔

آزادی کے بعد افسانہ نئے موضوعات کی زینت بنا اور افسانہ نگاری میں نئے تجربات ہونے لگے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء میں اردو افسانے میں نئی راہیں متعارف ہونے لگی۔ ساٹھ کی دہائی میں نئی نسل روایتی اسلوب و تکنیک سے انحراف کرنے لگی اور حقیقیت نگاری کی جگہ علامت نگاری نے لے لی۔ اس دور کے افسانے کو جدید افسانہ کہا جانے لگا۔ ناقدین کی ایک جماعت جدید افسانے کو ترقی پسند افسانے کی ضد تصور کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ روایتی افسانہ اپنے خاص اسلوب کے دائرے میں مقید ہو چکا تھا، نئی جہات اور جدت کو اس دائرے میں آنے کی خاطر خواہ اجازت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جدید افسانہ نگاروں نے روایتی حدود و قیود کو توڑنے کی کوشش کی اور روایت سے بغاوت کرتے ہوئے نئے تجربات عمل میں لائے جس سے جدید افسانہ منظر عام پر آیا۔[۴۶] کچھ ناقدین جدید افسانے کی حمایت میں لکھتے ہیں اور اسے نئی جہات کا علمبردار تصور کرتے ہیں۔ معاصر زندگی داخلی و خارجی انتشار بڑھ چکا تھا۔ تشکیک کے رجحان میں اضافہ ہوتا گیا اور انسان سماجی و نفسیاتی بحران کا شکار ہوتا رہا۔ جدید افسانہ نگاروں نے فرد کے احساسات و جذبات کو نئے رنگ میں ڈھال کر پیش کیا۔ جدید افسانے کے موضوعات کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش لکھتے ہیں:

"انتشار و بحران ، خوف و دہشت ، مایوسی و بیزاری ، بے معنویت اور لغویت، تشکیک و تذبذب ، برہمی و احتجاج ، تنہائی و بیگانگی اور اجنبیت جیسے موضوعات بھرے پڑے ہیں"۔ (۴۷)

جدید زندگی میں نئے رجحانات نے جنم لیا۔ میکانکی ترقی اور اس کے نتائج نے فرد کی زندگی کو یکسر بدل دیا۔ افسانہ نگاروں نے اس بدلی صورتحال کو اپنی تخلیقیت کا حصہ بنایا۔

i. جدید اردو افسانہ اور جدید زندگی

جدید افسانے کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب نو مولود ریاست خارجی و داخلی مسائل کے انبار میں گھری ہوئی تھی۔ فسادات، مہاجرین کی آبادکاری، صحت، روزگار، آمد و رفت اور دیگر ہر شعبہ ہائے زندگی میں مشکلات ہی مشکلات تھیں۔ انگریزوں سے آزادی حاصل کر کے آنے والے مہاجروں کو اپنوں کی غلامی نے آگھیرا، سیاسی بدلاؤ کے نتیجے میں حکومتیں بار بار تبدیل ہوتی رہیں اور چند سالوں میں جمہوریت کا گلا گھونٹ کر مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ سیاسی بھونچال، سماجی عدم توازن، معاشی عدم استحکام، معاشرتی پسماندگی نے فرد کو شعوری اور لاشعوری کشمکش میں مبتلا کر دیا جس کے نتیجے میں جبر، گھٹن، تنہائی، کرب، تناؤ اور خوف جیسی کیفیات نے جنم لیا۔ ان داخلی عناصر سے روایتی افسانے کا اسلوب بدل گیا۔ جس سے جدید افسانے کا تاثر اجاگر ہوا۔ اور یوں جدید افسانے میں ان مذکورہ عناصر کو جگہ ملی اور روایتی افسانے سے انحراف کرتے ہوئے نئے اسلوب و تکنیک کے تجربات میں جدید افسانے کا آغاز ہوا۔

جدید افسانے کا آغاز فوری نہیں ہوا بلکہ اس کے فکری پس منظر میں ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کے افسانوں کے موضوعات شامل تھے۔ ترقی پسندوں پر پابندی نے تحریک کو کمزور کیا جس سے ترقی پسندی کی حدود و قیود سے بغاوت کی فضا قائم ہوئی، حلقے کی فنی جمالیات مدھم ہونے سے نئی سوچ کے لئے راہیں ہموار ہونا شروع ہوئیں اور ایک عرصے سے لکھے جانے والے روایتی یا یک جہتی افسانوں سے تنگ آ جانے والے نوجوان ذہنوں نے نئے اسلوب و تکنیک کو آزمایا جس کی بدولت اردو افسانے کے فنی و فکری رجحانات اور لوازمات میں وسعت پیدا ہوئی جو جدید افسانوں کی صورت میں ساٹھ کی دہائی اور اس کے بعد درجہ بہ درجہ

سامنے آتی گئی۔ ترقی پسند تحریک کمزور ہونے اور ارباب ذوق کی ڈوبتی کشتی کو سہارا نہ ملنے کا براہِ راست فائدہ نئ جماعت (جدید افسانہ نگار) کو ہوا جو جدید افسانہ لکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم لکھتی ہیں کہ

> " نئ کہانی کی اپنی شناخت کسی ایک پہلو سے نہیں بلکہ مختلف الابعاد زاویے رکھتی ہے۔ فسادات کے نتیجے میں تہذیبی توڑ پھوڑ اور مارشل لا کے سبب سیاسی و سماجی شکست و ریخت نے اردو افسانے پر جو لاشعوری اثرات مرتسم کئے ، نئے افسانے میں المیاتی صورت ان ہی کی پیدا کردہ ہے۔ ایک غم ، غصہ ، الجھن ، شدید رویے نئے افسانے کے عمومی موضوعات ہیں "۔ (۴۸)

ترقی پسند افسانہ نگاروں نے داخلیت کی بجائے خارجیت اور حقیقت نگاری پر زور دیا لیکن ساٹھ کی دہائی ایک نئ فکر کے ساتھ داخلیت پر اثر انداز ہوئی اور جدید افسانہ نگاروں نے حقیقت نگاری کی جگہ علامت نگاری اور خارجیت کی جگہ داخلیت پر زور دیا۔ نئ لسانی تشکیلات کے وجود سے روایتی اسلوب یکسر تبدیل ہو گیا۔ جدید افسانہ نگاروں نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے جدید افسانہ علامتی، استعاراتی، تمثیلی اور تجریدی انداز میں تحریر کیا۔ بیانیہ ، پلاٹ اور کردار جیسے عناصر کمزور پڑنے سے جدید افسانے کی ترسیل مشکل ہو گئی ۔ قاری سیدھے اور منظم افسانے کا عادی تھا جسے قاری نے مشکل سے قبول کیا۔ ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں

> " جدید افسانہ نگاروں نے روایتی بیانیہ اسلوب کی بجائے علامتی و استعاراتی انداز اختیار کیا۔ عدم تکمیلیت ، ابہام ، اشاریت ، رمز و ایما ، تجریدیت اور شعریت اس اسلوب کی نمایاں خوبیاں بن کر ابھریں ۔ تحریر کے ٹھوس پن کی بجائے سیال کیفیت زیادہ اہم ہو گئی "۔ (۴۹)

سیاسی عدم استحکام اور ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء نے فرد کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے جس سے سیاسی و سماجی جبریت کی فضا پیدا ہوئی ۔ یہ جبریت فرد کی زندگی میں خارج سے داخل میں سرایت کرتی گئی جس سے داخلی دنیا میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انسان کی قدر انسان کی نظر میں کمتر ہوتی گئی اور انسان ایک دوسرے سے دور بھاگنے لگا۔ رشتوں کی پامالی معمول بن گئی ، مشترکہ خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا، معاشی تنگدستی کا اثر فرد کے خاندانی نظام پر پڑا جس سے کئی مسائل نے جنم لیا۔ کفیل کے لئے گھر چلانا مشکل ہوتا گیا، یہ وہ مسائل تھے جو جدید افسانے کا موضوعِ خاص بنے۔ جدید افسانہ ذات کی تلاش، داخلی تہہ داریوں کے کھوج اور نفسیاتی

کشمکش کو کریدتے ہوئے فرد کے کرب، تناؤ، ڈپریشن، خوف، جبر اور گھٹن جیسی کیفیات تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں معاشرہ کھوکھلے مجسمے کی صورت اختیار کر چکا تھا جس میں سماجی ناانصافی، طبقاتی تقسیم، سیاسی و سماجی جبر نے معاشرتی اقدار کو پامال کر دیا تھا۔ ایسے ماحول میں انسان خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگا، ذہنی و جسمانی تناؤ بڑھتا گیا۔

ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جدید تناظر میں ادب زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے عہد کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانوی ادب کے ہر عہد میں زندگی کو گہری نگاہ سے دیکھا گیا اور ایک نئی زندگی کی تلاش میں اہم کردار ادا کیا۔ جدید افسانہ اپنے ساتھ جدید زندگی کا تصور لئے ہوئے ہے۔ جدید افسانے کے موضوع جدید زندگی کے عکاس ہیں۔ جدید زندگی میں داخلیت کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اندر کی زندگی باہر کی زندگی سے منسلک ضرور ہے لیکن دونوں کی حدود مختلف ہیں۔ جدید زندگی تقسیم کے بعد آزادی کا پروانہ لئے پاکستان اور ہندوستان کے باسیوں کی روحوں پر وارد ہوئی۔ سیاسی و سماجی حالات، معاشی نظام، دیہات سے شہر ہجرت، صنعتی پیش رفت، سائنسی ترقی، نفسیاتی کھوج سب جدید زندگی کا خاصہ ہیں جن کی بدولت جدید افسانے نے جدید زندگی کی نئی جہات کو سامنے لانے میں کردار ادا کیا۔ اجتماعی زندگی سے انفرادی زندگی کے محرکات کی پڑتال جدید افسانے کا اولین مقصد ہے۔

جدید افسانہ نگاروں نے سیاسی اور سماجی حالات سے چشم پوشی نہیں کی بلکہ ان کی بدولت انسان کے اندرون خانہ پڑنے والے اثرات کو موضوع بنایا۔ ان داخلی مسائل کی نشاندہی سے سماجی منفی رویوں، سیاسی جبریت، اقتصادی عدم استحکام، خاندانی پیچیدگیوں کی حقیقت ابھر کر سامنے آئی جو جدید افسانے کا خاصہ ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> "اب افسانہ کا رخ خارج سے ہٹا کر باطن کی Kaleidoscopic کی دنیا کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ افسانہ نگار اب زندگی کی درست تصویر کشی کے لئے گلی کی نالیاں نہیں چھانتا بلکہ داخلی خلا میں سفر کرتا ہے۔ ترقی پسند ادب میں انسان اور انسان دوستی پہلے آدرش بنے اور پھر نعرہ۔ لیکن جدید ترین افسانے نے اس نعرہ کو کوئی اہمیت نہیں دی گو اس نے بھی انسان ہی کو اپنا موضوع قرار دیا لیکن اندازِ نظر تحلیلی رکھا۔ چنانچہ آج کے افسانوں میں انسان اپنی ذات کے ہفت خواں طے کرتا نظر آتا ہے۔ انتشارِ ذہن جس

نفسی تقسیم پر منتج ہوتا ہے اس کی تصویر نظر آتی ہے اور شکست ذات جن المیوں کو جنم دیتی ان کی کہانی سنائی جاتی ہے۔ حقیقت پسندی تو یہ بھی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ ترقی پسند افسانے نے اگر خارجی حقیقت نگاری پر زور دیا تو موجودہ افسانے نے داخلی حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنایا"۔ (۵۰)

صنعتی ترقی نے انسان کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے، انسان نے معاش کے لئے شہروں کا رخ کیا، مزدوری، ملازمتوں کے حصول کے لئے تگ ودو کی اور شہری زندگی کی رنگینیوں میں اپنی ذات کو دفن کر دیا۔ صنعتی نظام سے انسان کی مادی زندگی پر آسائش بھی ہوئی اور پر پیچ بھی۔ دولت کی لالچ اور رتبے کی برتری جیسے مقاصد نے مشینی زندگی کا تصور قائم کیا جو جدید زندگی کی ایک کڑی ہے۔ شہزاد منظر رقمطراز ہیں کہ

"ترقی پسندوں کے ہاں پورے معاشرے کو دیکھنے، سمجھنے اور تجزیہ کرنے کا انداز اجتماعی تھا اور اسی لئے وہ معاشرے میں ادب کے ذریعے فکری انقلاب لانے پر یقین رکھتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اظہار کا جو طریقہ اختیار کیا وہ قاری سے براہِ راست تخاطب تھا چنانچہ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے علامتی طرزِ اظہار کے مقابلہ میں وضاحتی طرز بیان کو ترجیح دی۔ اس کے برعکس جدید افسانہ نگاروں کا زندگی اور اس کے مسائل کو سمجھنے اور اسے پرکھنے کا انداز انفرادی تھا اس لئے انہوں نے صنعتی دور کے انسان کی معاشی بدحالی اور سماجی پسماندگی کے مقابلہ میں اس کی فکری اور جذباتی ناآسودگی، انسان کی داخلی شخصیت کے بکھراؤ، اقدار کی شکست وریخت، صنعتی معاشرے میں انسان کی تنہائی نیز زندگی کی معنویت، ذات کی تلاش جیسے موضوعات کو اہمیت دی اور اس کے اظہار کے لئے انہوں نے بیانیہ اسلوب کی بجائے علامتی طرزِ اظہار کو اپنایا"۔ (۵۱)

جدید افسانے نے مشینی زندگی سے پیدا ہونے والے داخلی محرکات کو اپنے دامن میں جگہ دی اور واضح کیا کہ انسان کیسے خود کو مادیت پرست بنا رہا ہے جس سے اس کی عائلی اور خاندانی زندگی متاثر ہو رہی ہے، گھر، خاندان، سماج کس حد تک سماجی بے راہ روی کا شکار ہے۔ انسان دولت کے حصول کے لئے اپنی زندگی کو داؤ پر لگائے جا رہا ہے اور یہی انسان جب بڑھاپے کو پہنچتا ہے تو اولاد، رشتہ دار اس کی پرواہ تک نہیں کرتے۔ صبا اکرام لکھتے ہیں:

"صنعتی ترقی کے ساتھ مادیت پرستی کی جڑیں بھی مضبوط ہوتی گئیں اور آدمی ہوسِ زر میں مبتلا ہو کر اس پستی پر آ گیا جہاں پہنچ کر جھوٹ، فریب، ہیرا پھیری، رشوت اور بدکاری کوئی بدکاری نہیں رہ جاتی بلکہ حصول زر کی راہ میں کار آمد حربہ ثابت ہوتی ہے"۔ (۵۲)

وقت کے ساتھ ساتھ جدید زندگی بھی تغیر و تبدل کا شکار رہی جس سے جدید افسانے کے موضوعات میں تنوع ملتا ہے۔ جدید افسانہ جدید زندگی کی تاریکیوں کو منظر عام پر لانے میں بہت اہمیت کا حامل ہے جیسا کہ دفتری سیاسی معاملات، اداروں میں سیاسی مداخلت، تشکیک آمیز رویے، تعلیمی اداروں کا ماحول، شہری زندگی اور انسانی جم غفیر، انسانی خرید و فروخت، درندہ صفت عناصر کی بھرمار، مصنوعی چہرے، بناوٹی رشتے وغیرہ۔ معاشرتی آلودگی نے انسان کی نفسیات کو بھی متاثر کیا۔ جس سے انسان ذہنی کرب اور عدم اطمینان کا شکار رہا۔ شمس الحق لکھتے ہیں:

"یہ افسانہ، یا خود مختار اور آزاد تخلیقی استعارہ یا متضاد حقائق کی آمیزش سے وجود میں آنے والی افسانوی حقیقیت، داخلی عوامل و احساسات اور خارجی مظاہر و معروضات کے درمیان شعوری اور لاشعوری روابط اور ہم آہنگی کا اظہار ہے"۔ (۵۳)

ستر کی دہائی جدید افسانے میں ایک نئے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ گو کہ یہ دور بھی آمریت کا دور تھا لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ نے حب الوطنی اور قومی یکجہتی کی فضا قائم کی۔ جس سے فرد کے داخلی محرکات عارضی طور پر سہی مگر نئی سمت کا تعین کرنے لگے۔ ستر کی دہائی میں جدید افسانہ نئے میلانات سے آشنا ہوا اور یوں فردیت / انفرادیت پسندی کی بجائے اجتماعیت کی جھلکیاں نظر آنا شروع ہوئیں جس سے زندگی کے خارجی پہلوؤں کو دوبارہ سے افسانے کے قریب لانے کی کامیاب کوشش کی گئی۔ لیکن اس کے باوجود ذات کی شناخت کا مسئلہ اور فرد کی گمشدگی کا احساس برقرار رہا جو حالات کے جبر کی وجہ سے لاشعوری طور پر حاوی تھا یا اس دور کے انسانی لاشعور میں گھر کر گیا تھا۔ (۵۴)

ستر کی دہائی کے بعد افسانہ نگاری میں نئی روش نے جنم لیا جس میں جدید افسانہ اور ترقی پسند افسانہ کا حسین امتزاج ابھر کر سامنے آیا۔ خارجی اور داخلی زندگی کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر پرکھا جانے لگا۔ سیاسی انتشار، معاشرتی ناہمواری، صنعتی رجحان، علم و ہنر کے منفی رویوں کی بدولت انسانی زندگی کا سکون متاثر ہوا، اس

انتشار زدہ ماحول نے انسان کو الجھا کے رکھ دیا۔ انسان سماجی و نفسیاتی لحاظ سے مایوسی اور کرب کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ ۱۹۷۷ کا مارشل لا سے آزادی رائے کا خاتمہ ہو گیا۔ دانشوروں سے غیر انسانی سلوک، سیاسی جبریت، سر عام سزاؤں کا خوف، انتقامی کاروائیوں نے جدید زندگی کا نیا روپ پیش کیا جس میں انسان آزادی کا سانس لینے سے قاصر رہا اور مزاحمت، نفرت، غم و غصہ جیسے محرکات سامنے آنا شروع ہوئے۔ اس کے بعد سیاسی عدم استحکام کی بدولت حکومتیں تھوڑے عرصے بعد تبدیل ہوتی رہیں، جس سے اقتصادی پستی، غربت، مہنگائی اور لا قانونیت نے فروغ پایا۔ معاشرہ کھوکھلے پن کا شکار ہو گیا۔ جدید افسانہ نگاروں نے ایسے حالات میں مزاحمتی افسانوں کے ساتھ انسانی زندگی کے تاریک پہلوؤں کو اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا۔ یہ مابعد جدید افسانے کا دور تھا جو ابھی تک جاری و ساری ہے۔ اکیسویں صدی نے آمریت کی گود میں آنکھ کھولی، روایتی مسائل کے ساتھ جدید زندگی دہشت گردی جیسے انجانے خوف کا شکار ہوئی۔ دہشت زدہ ماحول نے انسان کو سماجی اور نفسیاتی لحاظ سے منتشر کر دیا۔ مذہبی تہواروں، تجارتی مراکز، پارکس، اڈے، سرکاری و نجی ادارے سب دہشت گردی کی لپیٹ میں آئے۔ جس نے انسانی زندگی کو بکھیر کر رکھ دیا۔ خوف و ہراس کے عالم میں زندگی کی سانسیں رکتی نظر آئیں اور انسان نفسیاتی اذیت، تشکیک جیسے رویوں کا حامل ٹھہرا۔ گھریلو الجھنوں میں اضافہ ہوتا گیا اور انسان دشمنی بڑھتی گئی۔ افسانہ نگاروں نے ایسے موضوعات پر کھل کر لکھا۔

انفارمیشنل ٹیکنالوجی کے اس دور میں انسان Digitalize یعنی ہندسوں میں بٹ چکا ہے، افراتفری، انتشار اور شور میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے، انسان خود کو چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے بھی کمپیوٹر کا غلام کر رہا ہے۔ جدید زندگی میں کمپیوٹر کا عمل دخل زیادہ ہے اور اب زندگی کے معاملات کو کمپیوٹر کے ذریعے قید کیا جا رہا ہے۔ جس سے انسانی زندگی کی مسلمہ حقیقت مجروح ہو رہی ہے۔ انسانی اقدار کمپیوٹر کے مرہون ہو چکی ہیں۔ ایک شخص دفتر میں بائیو میٹرک حاضری کے خوف سے وقت کی پابندی کرتا ہے، اخلاقی طور پر وقت کی پابندی کرنا معیوب سمجھا جا رہا ہے۔ ہر وہ جگہ جہاں انسان اخلاقی اقدار کھو بیٹھتا ہے وہاں کمپیوٹر لگایا جا رہا ہے، اس کا مقصد چاہے کسی کاونٹر پر کیسیر کی بے ایمانی کا تدارک کرنا ہو یا کسی چیز کی حفاظت کے لئے سی سی ٹی وی کیمرے نصب کرنے ہوں۔ انسان اپنی اقدار کی آنکھ کی بجائے کیمرے کی آنکھ سے زیادہ خوفزدہ رہتا ہے۔ جدید افسانے میں ان اخلاقی اقدار کی پامالی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تشویش کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ جدید زندگی الجھاؤ کا شکار ہے، انسان دن بدن کٹھ پتلی بنتا جا رہا ہے۔ پہلے اشیا انسانی ضرورت کے لئے بنائی جاتی

تھیں اب انسان کو اشیا کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ گلوبلائزیشن حاوی ہو رہی ہے۔ نفسا نفسی اور گھٹن زدہ ماحول نے نفسیاتی جبر اور خوف جیسی کیفیات پیدا کر دی ہیں۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش رقمطراز ہیں:

> " پہچان کی گمشدگی نے آج فرد کو کرب میں مبتلا کر دیا ہے اس کی بنیادی وجہ وہ مشینی ماحول ہے جس میں فرد ایک روبوٹ بن کر رہ گیا ہے بلکہ اس مشینی ماحول نے رویوں، نظریوں اور تصورات کے سلسلے میں بھی اس کی سوچ کو میکانکی بناڈالا ہے "۔ (۵۵)

جدید زندگی میں میڈیا اس گلوبلائزیشن کے ستون کا درجہ حاصل کر چکا ہے جس کا انسانی زندگی میں عمل دخل دن بدن بڑھ رہا ہے۔ آزاد میڈیا کا تجارت کا لبادہ اوڑھنے سے معاشرتی تصادم اور ذہنی کرب بڑھ رہا ہے۔ میڈیا مقصدیت کے تناظر میں سماج کو بلیک میل کرنے میں زیادہ کردار ادا کر رہا ہے۔ گو کہ میڈیا کے ذریعے سیاسی و سماجی حالات سے آگاہی ملتی ہے لیکن اس کے برعکس نفسیاتی تناؤ بھی بڑھانے کا موجب بن چکا ہے۔ محب وطن طبقے میں سیاسی و مذہبی اجارہ داروں کے خلاف غصہ بڑھنے سے احتجاج اور مزاحمت جیسے رویے سامنے آ رہے ہیں جس کا نتیجہ تصادم کی صورت میں نکلتا ہے۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے علاقائی، لسانی اور مذہبی تعصب کو بڑھاوا دیا ہے جس سے سماجی دوریاں پیدا ہو رہی ہیں اور معاشرتی اور اخلاقی اقدار پامال ہو رہی ہیں۔ جدید افسانے میں ایسے حالات کو موضوع بنایا جا رہا ہے اور میڈیا کا جبر بھی جدید افسانے کی زینت بن رہا ہے۔ جدید افسانہ نگاروں نے زندگی کے ہر پہلوؤں کو نہایت عمدگی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے، اور ساٹھ کی دہائی سے شروع ہونے والا جدید افسانہ اکیسویں صدی تک اسلوبیاتی و موضوعاتی تغیر و تبدل کے ساتھ کامیابی سے سفر طے کرتا آیا ہے۔ آج کا افسانہ اپنی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے جو فرد کے داخل اور خارج دونوں کی تقلیب سے جہانوں کو پرکھنے، سمجھنے اور منظر عام پر لانے میں اپنی مثال آپ ہے۔

ii. جدید اردو افسانے میں جبر اور خوف کے عناصر: روایت کا مطالعہ

جدید افسانہ ساٹھ کی دہائی میں نئی لسانی تشکیلات اور اسلوب کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ یہ وہ دور تھا جب روایتی افسانہ طویل عرصے تک ایک خاص سمت میں سفر طے کرتے جمود کا شکار ہو گیا تھا۔ حقیقت نگاری کا اُسلوب اب معدوم ہو رہا تھا۔ ملکی حالات کے تناظرات بدل چکے تھے۔ سیاسی عدم استحکام، مارشل لا، سماجی

پستی، نفسیاتی کشمکش نے نئی فکری جہات سے روشناس کروایا۔ نئی نسل نے سابقہ روایت سے انحراف کرتے ہوئے نئی لسانی تشکیلات اور اسلوب کے تحت جدید افسانے کا آغاز کیا۔ ابتدا میں ایک خاص جماعت نے جدید افسانے لکھنا شروع کیے لیکن تھوڑے ہی عرصے میں اس سے وابستہ افسانہ نگاروں کی ایک لمبی قطار کھڑی ہو گئی۔ ،مارشل لا کے بعد سیاسی و سماجی منظر نامہ تبدیل ہو گیااور معاصر زندگی سیاسی و سماجی جبریت کا شکار ہو گئی جس نے فرد کی داخلی و خارجی زندگی کو بہت متاثر ہوئی، جبر اور خوف کی فضا پیدا ہوئی۔ رشید امجد لکھتے ہیں کہ

" ساٹھ کی دہائی پاکستانی معاشرے میں سماجی اور سیاسی دونوں حوالوں سے الجھنوں کا زمانہ ہے، پہلا مارشل لا لگے دو سال ہو چکے تھے اور اس کی ظاہری چمک ماند پڑ چکی تھی۔ نئی لسانی تشکیلات کے نتیجے میں علامتی انداز اگرچہ فنی حوالوں ہی سے سامنے آیا تھا لیکن پسِ منظر میں کہیں سیاسی جبر کا دباؤ موجود تھا"۔[۵۶]

ساٹھ کی دہائی میں سیاسی انتشار کی بدولت انسان نفسیاتی بھول بھلیوں میں اپنی ذات گمشدہ کر بیٹھا۔ انتظار حسین نے تقسیم کے بعد نئی روایت متعارف کروائی جو سابقہ روایت (ترقی پسندی) کے متضاد تھی۔ انتظار حسین کے ابتدائی افسانے تقسیم، ہجرت، فسادات اور تہذیبی زوال پر ہیں لیکن "آخری آدمی" علامتی و تمثیلی انداز میں معاشرتی پسماندگی کی عمدہ مثال ہے، ان کا افسانہ 'آخری آدمی' اور 'زرد کتا' انسان کی جبلی جبریت کا عکاس ہے۔ انتظار حسین کے افسانے سیاسی جبریت، الجھن زدہ ذہن، نفسیاتی دباؤ کی عمدہ پیشکش ہیں۔ "کایا کلپ اور سوئیاں، خوف اور دہشت کی نفسیات کو ابھارتے ہیں"۔[۵۷] انتظار حسین معاصر زندگی کے نباض ہیں۔ فرد کے داخل اور خارج کو خوبصورتی سے کریدتے ہیں۔ شہزاد منظر لکھتے ہیں:

" جدید افسانے میں فکری عناصر کی عمدہ مثالیں انتظار حسین کے افسانے 'خواب اور تقدیر' اور 'ذات' میں ملتی ہیں۔ ان دونوں افسانوں کا مرکزی موضوع جبر ہے۔ انسان جبر کے دائرے میں اس طرح گھِرا ہوا ہے کہ لاکھ کوششوں کے باوجود اس سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتا اور اس کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ ازل سے ابد تک۔ یہ جبر تاریخ کا بھی ہو سکتا ہے، سیاست اور معاشرے کا بھی اور انسانی تقدیر کا بھی۔ انسان اس نظریے کے تحت مجبورِ محض ہے"۔[۵۸]

ساٹھ کی دہائی اور بعد سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی صورتحال میں درجہ بدرجہ تغیر تبدل نے انسانی زندگی کو الجھادیا۔ متذکرہ تناظرات کو انور سجاد نے جدید افسانے میں اجاگر کیا۔ انور سجاد جبریت، تشدد، خوف اور تنہائی کو بخوبی اپنے افسانوں میں علامتی، استعاراتی اور تمثیلی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں:

" انور سجاد کے افسانوں میں زیادہ تر شعور کی رو، آزاد تلازمہ خیال ،اور خوابوں کی تکنیک کا استعمال ہے ۔'سیاہ رات '،'پتھر لہو کتا'،'دوب ہوا اور لنجا'،'سازشی '،'چھٹی کا دن '،'سونے کی تلاش '،'پرندے کی کہانی '،'واپسی دیو جانس کلبی '،'روانگی 'اور 'کیکر'ایسے افسانے ہیں جن میں عصری جبر ، فرد کے خوف اور اکلاپے اور قدروں کے زوال کو استعاراتی و تجریدی اُسلوب میں پیش کیا گیاہے"۔[۵۹]

جدید افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام خالدہ حسین کا ہے۔وجود کے خارج اور باطن کو عمیق نظری سے دیکھتی ہیں اور جبر اور خوف کو اجاگر کرتی ہیں۔ خالدہ حسین باطن کو صوفیانہ انداز میں جھنجھوڑنے کا فن جانتی ہیں۔ جدید زندگی کی نباض ہونے کی بدولت عصری زندگی کے چھوٹے چھوٹے خوف، ڈر سے پردہ اٹھاتی ہیں ۔'ایک رپورتاژ،'،؛پہچان'،'سواری' جیسی کہانیاں خوف اور جبری کیفیات کی عکاس ہیں۔ جدید زندگی کے مسائل کو سنجیدگی سے پیش کرنے میں منشایاد کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔منشایاد زندگی کے حقائق کو فنی پختہ کاری سے سامنے لاتے ہیں، ان کے افسانے معاصر زندگی کے مسائل کو دیہی اور شہری زندگی کے افتراق کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شفیق انجم رقمطراز ہیں کہ:

" منشایاد کے افسانوں میں ذات کا جبر، معاشرے اور ماحول کے جبر اور تقدیر وقت کے جبر کی مختلف صورتوں کی بھی عکاسی ہے۔خارج اور باطن کے تال میل سے انھوں نے انسان کی ازلی و ابدی بے بسی، مجبوری ولاچاری کے تصور کو نمایاں کیا اور سیاسی وطبقاتی جبریت کی بدولت مختلف تہوں کی نقاب کشائی کی ۔'بوکا'،'تماشا'،'دھوپ دھوپ دھوپ'اور'تھوہر کا کانٹا'جبر کے مسلسل عمل کی کہانیاں ہیں"۔[۶۰]

ستر اور اسی کی دہائی سیاسی و سماجی عدم توازن کی دہائی ہے۔ اس دور میں ملکی نظام کشمکش کا شکار رہا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی، بھٹو کی پھانسی، مارشل لا نے زندگی کا نقشہ تبدیل کر دیا۔ ریاستی جبریت نے خوف کی فضا بلند کی۔ انور سجاد، خالدہ حسین اور رشید امجد کے ساتھ اعجاز راہی نے سیاسی جبریت پر نا صرف مزاحمت کی بلکہ سراپا احتجاج نظر آئے۔ اس دور میں ادبا کی ایک بڑی جماعت پابندیوں اور خوف کی بدولت چپ کا شکار تھی لیکن اعجاز راہی اس دور میں اپنا حق ادا کرتے نظر آئے۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'تیسری ہجرت' سیاسی و سماجی خلفشار کو اجاگر کرتا ہے اور سیاسی بربریت کو منظر عام لاتا ہے۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم لکھتی ہیں:

" ان کا بنیادی موضوع سماجی انتشار میں فرد کی اندرونی و باطنی شکست وریخت ہے۔ انہون نے سیاسی جبر میں رہنے والوں کی تحلیل نفسی کر کے ان عوامل تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جو صدیوں سے ہمارے معاشرے پر چھائے ہوئے ہیں۔ اعجاز راہی نئے افسانہ نگاروں میں واحد شخص ہیں جو عملی طور پر بھی سیاسی جدوجہد میں شریک رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے جبر کے اظہار میں ان کا تجربہ ذاتی ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد بھی ہے"۔ (۶۱)

جدید افسانے کا کینوس بہت وسیع ہے جس سے جدید اردو افسانے کے موضوعات میں تنوع ملتا ہے۔ بیسویں صدی کا ربع آخر جدید افسانے کا زریں دور تصور کیا جاتا ہے۔ افسانہ نگاروں نے ملکی و غیر ملکی حالات کے تغیر و تبدل کو نا صرف محسوس کیا بلکہ ادبی فن پاروں میں قید کیا۔ جدید افسانہ نگاروں نے انسان کی سماجیات کے ساتھ نفسیات پر خاطر خواہ توجہ دی۔ سماجی الجھنوں کے ساتھ نفسیاتی معاملات جدید افسانے کا خاص حصہ رہے ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں نے فرد کی شناخت اور اس سے وابستہ مسائل کو سنجیدگی سے پیش کیا ہے۔ انسان کے مصنوعی چہرے کو بے نقاب کیا۔ لاشعور اور شعور کے جبر و خوف کے عناصر جدید افسانوں میں عیاں ہیں۔ عرش صدیقی جدید افسانہ نگاروں میں فرد کی داخلی و خارجی زندگی کے عکاس ہیں۔ ظلم و جبر، تشدد، محرومی، تنہائی اور یاسیت ان کے خاص موضوع ہیں۔ داخلیت کی تہوں کو اپنے افسانوں میں تہہ بہ تہہ سمیٹتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں " عرش صدیقی کے ہاں داخل کی روشنی کو اور اندر کی آنکھ کو نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہے"۔ (۶۲)

جدید افسانہ نگاروں کی اولین صف میں احمد ہمیش کا نام قابل ذکر ہے۔ ظلم و جبر، محرومی، ناانصافی اور غیر انسانی رویے بہ طور خاص موضوع بنتے ہیں۔ داخلی افراتفری اور نفسی جبر جیسی کیفیات کو بخوبی بیان کرتے ہیں۔ احمد

ہمیش جدید افسانے کے سرخیلوں میں تصور کئے جاتے ہیں۔ زندگی کے تلخ حقائق کی پردہ پوشی کرنے کی بجائے علامتی پیرائے میں ڈھال کر سامنے لاتے ہیں۔'ہیں خواب میں ہنوز'،'اور'،'اگلا جنم'جبریت، بے بسی اور مجبور زندگی کی عمدہ مثالیں ہیں۔

احمد جاوید کی کہانیوں میں جبر اور خوف کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔ معاصر شہری زندگی کی تلخیوں اور پیچیدگیوں کے باعث جبریت اور ڈر جیسی کیفیات کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ احمد جاوید غریب کی بے بسی اور لاچارگی جیسی زندگی اور اس سے وابستہ مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ حشرات اور جانوروں جیسی علامات کے ذریعے جبر اور خوف کی کیفیات کو بخوبی منظر عام پر لانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ احمد جاوید جدید افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیاں اپنے منفرد لینڈ سکیپ کی وجہ اسے الگ حیثیت رکھتی ہیں۔ 'کیا جانو میں کون'، 'کھیل تماشا'،'کانچ کے شہر'،'مصاحبین خاص'،خودکشی' 'آثار'، 'آکاس بیل'، 'شام اور پرندے' اور 'زنجیر' جیسے افسانے جبر کی فضا قائم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی لکھتے ہیں:

"احمد جاوید کے افسانوں میں خوف کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ خوف موجودہ دور کے اکثر افسانہ نگاروں کے یہاں ایک رجحان کی صورت میں ملتا ہے لیکن ہر افسانہ نگار کے یہاں اس کے انفرادی تجربے کے تحت اس کے انداز مختلف ہیں۔ کسی کے یہاں خوف عدم تحفظ کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ کسی کے یہاں پہچانے جانے کا خوف ہے۔ کسی کے یہاں زندگی کے نئے جذبوں اور احساسات سے آگاہی کے بعد تجربوں کا خوف ہے۔ کسی کے یہاں عدم اعتمادی کا خوف ہے۔ یہ تمام خوف انفرادی رویے کے غماز ہیں۔ احمد جاوید کے یہاں یہ خوف مستقبل کی غیر یقینی صورتحال سے پیدا ہوتا ہے جس سے ہلکی سی اجتماعی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے"۔(۶۳)

ملکی حالات نے انسان کی آزادی کو ختم کر دیا۔ غیر جمہوری رویوں نے فرد کی زندگی کو پابندیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ آزاد ملک میں آزادی برائے نام رہ گئی۔ ایسی صورتحال کو ادبا نے اپنی قلم کے ذریعے احتجاج کرنے پر زور دیا۔ جس میں ایک نام سمیع آہوجا کا ہے۔ سمیع آہوجا انسان کی آزاد سانس کی حمایت میں سراپا احتجاج نظر آتے ہیں اور ظلم و جبریت جیسی صورتحال کو اجاگر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں کہ سمیع

آہو جا کی کہانیاں دراصل فرد کی آزادی کو کچلنے کی تصویریں ہیں۔ انہوں نے فرد کے داخلی محرکات کی نشاندہی بھی کی جن میں غم وغصے کے جذبات شامل ہیں۔ (۶۴)

جدید افسانہ نگاروں میں علی حیدر ملک کا نام الگ شناخت کا حامل ہے۔ علی حیدر ملک زندگی کی بے نورگی اور بے چہرگی کو موضوع بناتے ہوئے جبر کی صورتحال کو بیان کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں عدم تحفظ اور بے پہرگی کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ علی حیدر ملک کے افسانے سیاسی جبریت کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔ 'جھوٹے سچے خواب'، 'اندر کا جہنم' جیسی کہانیاں انسانی زندگی کی ہولناکی اور مجبوری کی عکاس ہیں۔ صبا اکرام لکھتے ہیں:

> "علی حیدر ملک باطل قوتوں کے خلاف نعرہ حق بلند کرنے کے ساتھ ساتھ جمہوری قدروں کی پامالی پر دکھ کا اظہار کرتے ہیں۔ 'ٹھنڈا سورج' اور 'گنبد کی فضا' میں اس عہد کی روح کی پرچھائیاں جھلملاتی نظر آتی ہیں"۔ (۶۴)

جدید دور کی ترقی میں گمشدہ انسان کی تصورکشی اے خیام کے افسانوں میں ملتی ہے۔ صنعت وحرفت میں بھٹکے انسان کے خارجی و داخلی جبر و خوف بہ طور خاص موضوع بنتے ہیں۔ ان کے افسانے انسان کی مادیت پرستی سے خاندان، تعلق داروں سے دوری جیسے ماحول کو اجاگر کرتے ہیں۔ انسان کیسے جبری طور پر اپنوں سے دور رہتا ہے اور مستقبل کے خوف سے کس طرح دوچار ہے، سب ان کے افسانوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اے خیام کے افسانے 'کچھوا'، 'پچیسواں گھنٹہ'، 'اجنبی چہرے'، 'آگ' جبر و خوف میں لپٹی زندگی کی صورتحال کو اجاگر کرتے ہیں۔ صبا اکرام لکھتے ہیں:

> "خیام کے سیاسی و معاشی جبر کے خلاف جو چار افسانے 'چیستاں' سیریز کے عنوان سے اس مجموعے (کپل وستو کا شہزادہ) میں شامل کیے ہیں ان کا تانا بانا حالانکہ موضوع کے اعتبار سے خارجی فضا بنتا ہے، مگر خیام نے ان افسانوں میں بھی سیاسی نظریات سے دامن بچاتے ہوئے داخلی احساسات کی سطح پر قائم رہ کر ان کی عکاسی کی ہے اور علامتوں کو کہیں دبیز کہیں ہلکے پردے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے"۔ (۶۵)

رشید امجد ایسے ماحول کا حصہ رہے جہاں انسان شناخت و عدم شناخت، داخلی کرب و جبر، نفسیاتی خوف، سماجی بے چہرگی، ویرانیت، احساسات و جذبات کی کشمکش جیسی صورتحال سے دوچار تھا۔ رشید امجد انسان کو اندر

اور باہر سے پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں کہ "رشید امجد کے افسانوں کا موضوعاتی دائرہ اپنے عہد کے جبر، عدم تحفظ، بیگانگی، منافقت اور بانجھ پن کے حوالے سے ہے"۔ [٦٦]

رشید امجد خود کو ظاہر اور باطن میں رکھ کر افسانے تخلیق کرتے ہیں۔ 'پت جھڑ میں خود کلامی'، 'خواب آئینے'، 'دھوپ میں سیاہ لکیر'، ''قطرہ سمندر قطرہ'، 'بے پانی کی بارش' اور 'بانجھ ریت اور شام' چند مثالیں ہیں جن میں خوف، تنہائی، اجنبیت، جبر، بے بسی جیسی کیفیات نمایاں ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں نے فرد کی داخلی خلفشار کو کدال سے کریدا ہے۔ رشید امجد نے جدید زندگی کے مسائل کو نئے آہنگ میں اجاگر کیا۔ معاشرتی بکھراؤ کے نتیجے میں فرد کی عائلی زندگی کی مشکلات کو تجرباتی بنیادوں پر افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کی کہانیاں صحیح معنوں میں جبر وخوف کی کیفیات کو اجاگر کرتی ہیں۔ ڈاکٹر ناہید رقمطراز ہیں:

> " ان کے موضوعات میں فرد کی اجنبیت، معاشرتی بے چہرگی اور تنہائی اہم ہیں جو در حقیبت ان کے فکری نظام کے نیو کلئیس یعنی عدم تشخص کی ہی مختلف صورتیں ہیں۔ [٦٧]

رشید امجد سے قبل اور معاصر دور میں جدید افسانہ نگاروں کی ایک لمبی قطار موجود ہے جنہوں نے جبر وخوف کو اپنے افسانوں میں اجاگر کیا۔ علامتی، تجریدی اور تمثیلی پیرائے میں سماجی ونفسیاتی سطح پر ہر دو کیفیات کو بخوبی بیان کیا۔ متذکرہ بالا افسانہ نگاروں کے علاوہ شوکت صدیقی، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، انور عظیم، اشفاق احمد، اے حمید، مسعود مفتی، قیوم راہی، مرزا حامد بیگ، آغا سہیل، اسد محمد خان، زاہدہ حنا اور منصور قیصر وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کے افسانوں میں خارجی وداخلی جبر وخوف کو بہ طور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عائشہ بیگم، تاریخ اور سماجیات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۷، ص ۲۶

۲۔ فیروز الغات، جلد اول، فیروز سنز، لاہور، ۲۰۰۱، ص ۲۲۳

۳۔ مولوی نور الحسن نیر، نوراللغات (جلد اول)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع سوم ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۹۴

۴۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ (جلد دوم)، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ، لاہور، طبع دوم ۱۹۷۴، ص ۳۶

۵۔ محمد عبد اللہ خان خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول ۱۹۸۹ء، ص ۱۸۶

۶۔ اشفاق احمد، محمد اکرام چغتائی (مرتبین)، فرہنگ اصطلاحات۔ جلد اول، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۵۴۴

7. Joyce M. Hawkins and Robert Allen, the Oxford Encyclopedic English Dictionary, Clarendon Press. Oxford, 1991, p 394

۸۔ شان الحق حقی، (مرتبہ و مترجم)، اوکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری، اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، گیارہویں طباعت، ۲۰۱۷، ص ۴۱۵

۹۔ قاضی عبد القادر، ڈاکٹر، کشاف اصطلاحات فلسفہ (اردو–انگریزی)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۴، ص ۱۱۲

۱۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۴۶۰

۱۱۔ سی۔ اے۔ قادر، پروفیسر، اکرام رانا (تالیف و ترجمہ)، کشاف اصطلاحات فلسفہ، بزمِ اقبال، لاہور، اشاعت اول، ۱۹۹۶ء، ص ۱۴

12. Webster ComprehensiveDictionary, J.G. Ferguson Publishing compny ,Chicago,1977 p349

۱۳۔ محمد صدیق قریشی، کشاف اصطلاحات سیاسیات۔ جلد اول، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۲۱۴

۱۴۔ فیروز الغات، جلد اول، فیروز سنز، لاہور، ۲۰۰۱، ص ۲۲۳

۱۵۔ نور الحسن نیر، مولوی، نور الغات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع سوم ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۶۵

۱۶۔ مہذب دہلوی (مرتب)، مہذب الغات، سمتا پرنٹنگ پریس، لکھنؤ، ۱۹۶۷ء، ۱۷۸

۱۷۔ سید احمد دہلوی، مولوی (مرتب)، فرہنگ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۶۱۳

۱۸۔ محمد عبد اللہ خان خویشگی، فرہنگ عامرہ، طبع اول ۱۹۸۹ء، ص ۶۵۱

۱۹۔ شان الحق حقی، (مرتب و مترجم)، اوکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری، اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، گیارہویں طباعت، ۲۰۱۷، ص ۵۷۰

۲۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، ص ۶۰۱

۲۱۔ صوفی گلزار احمد (مرتب)، کشاف اصطلاحات نفسیات، مقتدرہ، اسلام اباد، طبع اول ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۰

۲۲۔ صوفی گلزار احمد، پروفیسر، فرہنگ نفسیات، ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۸۴

23.Edward D'Angelo , The Problem of Freedom and Determinism , university of the Missouri press, Columbia, 1968, P 2

۲۴۔ انعام الحق، ڈاکٹر، نظریہ خیر، سر سید اکیڈمی، لاہور، ص ن، ص ۱۵۹

25.Clifford Williams, Hackett ,Free will and determinism (a diolog) , publishing compny, inianapolis, Indiana, 1980, P 4

۲۶۔ ول ڈیورانٹ، نشاطِ فلسفہ، مترجمہ ڈاکٹر محمد اجمل، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۸۹

۲۷۔ ایضاً، ص ۹۳

28. Edward D'Angelo , The Problem of Freedom and Determinism , university of the Missouri press, Columbia, 1968, P 2

۲۹۔ سی۔اے۔ قادر، ڈاکٹر، معاشریات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۴، ص ۲۴

۳۰۔ پاولو فریرے، مظلوموں کی ترقی، مترجمہ ارشاد احمد مغل، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۳۴

۳۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی شکستگی، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶، ص ۵۷

۳۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی باتیں، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶، ص ۷۶

۳۳۔ لینن، سامراج اور سامراجی، فکشن ہاؤس، لاہور، اشاعت اول ۲۰۱۲ء، ص ۷

۳۴۔ قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، اشاعت ہشتم، ۲۰۱۵ء، ص ۱۹۵

۳۵۔ شیر محمد اختر، سگمنڈ فرائڈ (حالات زندگی اور نظریات)، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۹۶

۳۶۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتب)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم ۲۰۱۸، ص ۸۶

۳۷۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ ــ بیسوی صدی کی تحریکوں اور رجحانات کی روشنی میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع دوم ۲۰۱۰، ص ۱۲۵

۳۸۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، سگمنڈ فرائڈ۔ نظریہ تحلیل نفسی، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۹، ص ۴۷

۳۹۔ شہزاد احمد، ژونگ (نفسیات اور مخفی علوم)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۶۱

۴۰۔ ڈاکٹر، سلیم اختر، تین بڑے نفسیات دان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۶۵

۴۱۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت اول، ۲۰۰۰ء، ۶۲۴

۴۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی شکستگی، ص، ۳۶

۴۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی باتیں، ص ۱۱۹

۴۴۔ ایضاً، ص ۵۵

۴۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، خود شناسی، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۷

۴۶۔ شہزاد منظر، جدید اردو افسانہ (تنقید)، منظر پبلی کیشنز، کراچی، اشاعت اول ۱۹۸۲ء، ص ۲۵

۴۷۔ سلیم آغا قزلباش، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۳۵۷

۴۸۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع دوم، ۲۰۱۰، ص ۳۱۹

۴۹۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ؛ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، ص ۲۴۸

۵۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ: حقیقیت سے علامت تک، اردو رائٹرز گلڈ، الہ آباد، اشاعت اول ۱۹۸۰ء، ص ۱۰۵

۵۱۔ شہزاد منظر، جدید اردو افسانہ (تنقید)، منظر پبلی کیشنز، کراچی، اشاعت اول ۱۹۸۲، ص ۴۶

۵۲۔ صبا اکرام، جدید افسانہ: چند صورتیں، فکشن گروپ آف پاکستان، کراچی، اشاعت اول ۲۰۰۱، ص ۹۲

۵۳۔ شمس الحق، نیا اردو افسانہ، (مضمون) مشمولہ: افسانے کی حمایت میں، مرتبہ شمس الرحمان فاروقی، مکتبہ جامعہ دہلی لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۰۶ ص ۷۸

۵۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب: رویے اور رجحان، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع اول ۲۰۱۰ء، ص ۶۸

۵۵۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، اشاعت اول ۲۰۰۰ء، ص ۶۱۵

۵۶۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب: رویے اور رجحان، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع اول ۲۰۱۰ء ص ۶۶

۵۷۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ؛ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، ص ۲۵۸

۵۸۔ شہزاد منظر، جدید افسانے کے فکری عناصر، (مضمون) مشمولہ: افسانے کے مباحث مرتبہ ایم اے فاروقی، بک ٹائم، لاہور، ۲۰۱۷ء، کراچی، ص ۵۱۳

۵۹۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ: بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، ص ۲۶۳

۶۰۔ ایضاً، ص ۲۷۵

۶۱۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، ص ۴۳۰۔

۶۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۴

۶۳۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۰، ص ۵۷۷

۶۴۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ: بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، ص ۲۹۰

۶۵۔ صبا اکرام، جدید افسانہ۔ چند صورتیں، فکشن گروپ آف پاکستان، کراچی، اشاعت اول ۲۰۰۱ء، ص ۱۱۶

۶۶۔ صبا اکرام، اے خیام کا افسانوی مجموعہ "کپل وستو کا شہزادہ"، مشمولہ: جدید افسانہ۔ چند صورتیں،

فکشن گروپ آف پاکستان، کراچی، اشاعت اول ۲۰۰۱ء، ص ۱۱۹

٦٧۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار: ڈاکٹر رشید امجد شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۵۴

۷۱۔ ناہید قمر، ڈاکٹر، اردو فکشن میں وقت کا تصور، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۲



باب دوم

رشید امجد کے افسانوں میں "جبر" کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

انسانی زندگی کی ابتدا فرد واحد سے ہوئی اور درجہ بدرجہ انسانی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ارتقائی عمل میں انسان ایک دوسرے سے ضرورتوں کی بنیاد پر منسلک رہا جس سے انسان گروہ بندیوں میں منقسم ہو گیا۔ یہی گروہ بندیاں انسان کی پہچان بنیں، وہی پہچان جس سے انسان کی شناخت قائم ہوئی۔ انسانی شناختوں نے سماج کو فروغ دیا۔ یوں انسان سماج کا نمائندہ قرار پایا۔ سماجی عمل ابتدائی طور پر انسانوں کے ملاپ سے وجود میں آیا۔ ابتدائی زندگی سے جدید زندگی تک کا سفر سماجی نظام کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ دنیا میں انسان کا انفرادی طور پر زندگی گزارنا مشکل تھا لہذا آپس میں میل جول، رشتے ناطے اور لین دین کا سلسلہ شروع ہوا جس کی بدولت ایک سماجی نظام تشکیل پایا۔

> "انسان کی ابتدائی زندگی چند بنیادی ضروریات سے عبارت ہوتی ہے۔ جس میں معاشی ضروریات، سماجی ضروریات، تمدنی ضروریات، سماجی تقاضے، نفسیاتی رجحانات سب شامل ہوتے ہیں"۔ [1]

وقت کے ساتھ ساتھ سماجی ڈھانچے میں حدود و قیود قائم ہوتی گئیں تاکہ منظم زندگی کے لئے اصول و ضوابط مرتب کئے جائیں۔ ہر دور میں سماجی عوامل ایسے سماجی تفاعل کا باعث بنتا رہا جس سے سماجی نظام میں ردوبدل ہوتا رہا۔ سماجی تشکیل میں جہاں فرد، افراد، ماحول، شناختوں اور عدم شناختوں کا عمل دخل رہا وہیں ان میں مغائرت و مماثلت کے عناصر، اور اس سے متاثرہ سماجی اداروں کا اہم کردار رہا ہے۔ جس میں خاندان، ثقافت، مذہب، معاش اور سیاست قابل ذکر ہیں۔ ان اداروں نے سماج پر گہرے اثرات ڈالے جس سے فرد کی زندگی انفرادی اور اجتماعی سطح پر کئی نشیب و فراز سے دوچار رہی۔ ان نشیب و فراز کا تعلق کسی نہ کسی صورتحال سے رہا ہے۔ یہ صورتحال قدیم تہذیبوں سے لے کر ماڈرن دنیا کے جدید ترین یا مابعد جدید سماج پر محیط ہے۔ مسلسل ارتقاء پذیر اس سماج میں جہاں قدیم انسان جکڑ بندیوں میں بندھا تھا، جدید سماج میں بھی انسان روایات، اصول و ضوابط اور قوانین کا پابند ہے۔

فرد کا سماج سے انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر گہرا تعلق رہا ہے۔ اور یہ دونوں سطوح آپس میں لازم و ملزوم تعلق میں بندھی ہیں۔ سماج میں انسان کا آپسی تعلق بھی انہی ضرورتوں کی بدولت قائم رہتا ہے۔ انسان جس سماج میں پرورش پاتا ہے اس کی رسوم و رواج، قوانین کا پابند ہو جاتا ہے۔ سماجی حدود و قیود سے انحراف بغاوت تصور کی جاتی ہے جس کا نتیجہ باغی فرد کے خلاف مزاحمت کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ مزاحمت بھی فریقین کے مابین دو طرفہ ہوتی ہے۔ جو سماج میں War of Tug کے مترادف تصور کی جا سکتی ہے۔ یہ دو طرفہ مزاحمت یا طاقت و حتمیت ایک لحاظ سے جبریت ہی کی صورت ہے۔ سماجی جبریت کا یہ پہلو فرد کی انفرادیت سے شروع ہو کر سماج میں اجتماعیت تک پھیل جاتا ہے۔ اس اجتماعیت میں افتراقیت کے کئی پہلو موجود ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے مزاحمت یا حمایت کی صورت میں ہمہ وقت متحرک رہتے ہیں۔ اس تخالف سے تفریق پیدا ہوتی جو سماج میں انسانی مغائرت کو تقویت دیتی ہے۔ یہ تفریق مال و دولت، خاندانی برتری، مذہبی انتہا پسندی کے ساتھ ساتھ رہن سہن کے طریقہ اور زبان کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ زبان ایک ایسا میڈیم ہے جو سماج میں جبریت کے پہلوؤں کو تحرک پہنچاتا ہے۔ سماجی رویوں میں تغیر و تبدل سے آپسی تعلقات پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ نفرت، لڑائی جھگڑے، تشدد، ظلم و زیادتی سے سماج میں انتشار کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ یہ انتشار تخریبی نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ جس سے عام آدمی کی زندگی زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ اگر سماج میں ایسے قوانین ہوں جس میں انصاف، مساوات کی بالادستی ہو تو انسان تعمیری رویوں کا حامل ہو گا۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ سماج پر سرمایہ دار، جاگیر دار اور سیاسی طبقات کی اجارہ داری قائم ہے جہاں عام آدمی کی زندگی جبر کا شکار ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ ہائے زندگی میں عام آدمی مشکلات سے دوچار ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

> "آج جب کہ صورت حال بدل گئی ہے، مگر اس کے باوجود سماج کی تقسیم انہیں بنیادوں پر قائم ہے جمہوریت اور عوامی طاقت کے نعروں کے باوجود آج عام لوگ اب بھی عزت و احترام کے خواہش مند ہیں۔"[۲]

سماج انسانی کردار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جس طرح سماج میں انفرادی اور اجتماعی پہلو باہم مربوط ہیں اسی طرح سماج میں مثبت اور منفی پہلو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہی اضداد جبر کو فروغ دیتی ہیں۔ انسان ان مثبت و منفی رویوں کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ انسان دوستی سے انسان دشمنی تک یہی پہلو کار فرما رہتے ہیں۔ اسی سے شدت اور دہشت پروان چڑھتی ہے۔ منفی کردار سماج میں جبر اور خوف کی فضا پیدا کرتے ہیں

جس سے پورے سماج پر اثر پڑتا ہے اور سماج فرقہ پرستی، انتہا پسندی، معاشی بدحالی، سیاسی عدم استحکام کا متحمل ہو جاتا ہے۔ سماج انسان کو روشنی سے اندھیرے اور اندھیرے سے روشنی کی طرف دھکیلتا ہے۔ کرداری تشکیل میں سماجی ادارے خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہر ادارے کا اپنا دائرہ کار ہوتا ہے جو فرد کو اس میں رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایسی صورتحال میں انسان جبرًا زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے خاندان، ملازمت سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ انسان ناچاہتے ہوئے بھی سماجی اداروں کے ساتھ چلنے پر مجبور ہے۔ سماجی رویوں کی بدولت انسانی کردار کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک سماج دوسرے سماج سے مختلف ہوتا ہے۔ دنیا میں ہر سماج کی اپنی اقدار ہیں اگر ایک معاشرے میں کچھ برا سمجھا جاتا ہے تو کسی دوسرے معاشرے میں اسے اچھائی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اور یہ حالات وواقعات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے جس سے فرد میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔

الف۔ رشید امجد کے افسانوں میں جبر کے سماجی تناظرات

رشید امجد کا تخلیقی سفر چھ دہائیوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے سماجی حالات کو بہت قریب سے دیکھا، جس میں فرد جبریت سے دوچار رہا۔ "دکھ ایک چڑیا ہے" کی کہانیوں میں فرد کی جبر زدہ جدید زندگی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جن میں موضوعات کی بجائے تناظرات کو نئی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ بعض افسانوں کے عنوانات سے بھی جبر کی صورتحال سے آگاہی ملتی ہے، جیسا کہ تمنا بے تاب، موسم بہار میں سوکھی ٹہنیاں، شہر گریہ ،پرندہ اداس ہے، وقت کے کوڑے دان میں اور معلوم کا دکھ قابل ذکر ہیں۔

i. جبر حیات

انسان اپنی مرضی سے جنم لے سکتا ہے اور نہ اپنی مرضی سے مر سکتا ہے۔ انسان کی سانسیں اس کی دسترس میں نہیں۔ زندگی اور موت کا تعین انسان کے بس میں نہیں۔ دنیا میں جتنے بھی انسان موجود ہیں یا گزر چکے ہیں، ان کا رنگ، خدوخال، جسامت اور آواز ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ بچپن سے بڑھاپے کے سفر کو کوئی روک نہیں سکتا اور نہ ہی انسان عمر کے کسی حصہ کو اپنی مرضی سے طویل یا مختصر کر سکتا ہے۔ یہاں سے انسان کی حیاتی کا جبر شروع ہوتا ہے۔ وہ جیسا پیدا ہوا ہے ویسا ہی بڑا ہو گا۔ معذوری اور تندرستی اس کے بس میں نہیں۔ رشید امجد کو انسان کی اس بے بسی کو اپنے افسانے 'تمنا بے تاب' میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

"مجھے ہونا بھی چاہیے تھا؟" مگر اس کا اختیار اس کے پاس نہیں تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ ہونے سے پہلے وہ کس صورت میں اور کس حال میں کہاں تھا۔ اگر تھا تو پھر ہونا بھی ضروری تھا اور اگر ضروری تھا تو کم از کم کہاں کی پسند تو پوچھ لی جاتی"۔ (۳)

رشید امجد نے یہ کہانیاں لکھی نہیں ہیں بلکہ کہانیوں نے خود کو رشید امجد کے قلم سے لکھوایا ہے۔ ان کے ہاں حقیقت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ رشید امجد زندگی کو مختلف زاویوں سے پرکھنے کے عادی ہیں جس سے فلسفیانہ مباحث جنم لیتے ہیں۔ ان کے ہاں حیات و ممات کی جبریت بھی فلسفیانہ تاثر سے بھرپور ہے۔ خالق اور مخلوق کے بین رشتے کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ اور عام طور پر استفہامیہ انداز اپناتے ہیں۔ رشید امجد کائنات میں فرد کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ان کا افسانہ 'تمنا بے تاب' انسانی تخلیق سے متعلق ہے، انسان کو تخلیق تو کر لیا گیا ہے لیکن اس سے اس کی مرضی نہیں پوچھی گئی۔ اسے بے بس کر دیا گیا اور جیسا خالق نے چاہا بھیج دیا۔ رشید امجد انسانی وجود کی اس بے بسی کو افسانے میں خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔

"کمہار کی مشتاق انگلیاں گھومتے چاک پر مختلف چیزیں بناتی چلی جاتی ہیں۔ اس کے سامنے پڑے ڈھیر میں کوئی کیا بننا چاہتا ہے اس کی اسے فرصت ہوتی ہے نا ضرورت۔ وہ تو بس بنانے والا ہے، اسے گندھی مٹی اور گھومتا چاک چاہیے۔ یہ اس کا مشغلہ ہے۔ مشغلے کے نتیجے میں جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ اس کا ہنر تو ہے لیکن اس شے کی کیا خواہش ہے، اس سے اسے کیا غرض!"۔ (۴)

رشید امجد کے ہاں حیاتی کا جبر دو طرح کا ہے، ایک وہ جس میں انسان سانس تو لیتا ہے لیکن عدم شناخت میں مجبور ہے اور دوسرا شناخت تو رکھتا ہے لیکن سانس لینے پر مجبور ہے۔ ایک زندگی سے واقف ہے اور عدم شناخت سے نجات چاہتا ہے۔ دوسرا زندگی سے بے بہرہ ہے ہو کر شناخت کا متلاشی ہے۔ دونوں جبریت کی صورتیں ہیں جو انسان کو زندہ رہنے کا حق نہیں دیتیں اور جبراً اس سماج کا حصہ ہیں۔ رشید امجد کی کہانیاں عام آدمی کی کہانیاں ہیں اور یہ کہانیاں کسی ایک سماج سے وابستہ نہیں بلکہ ہر اس سماج کی نمائندہ ہیں جہاں جبری صورتحال ہے۔ رشید امجد انسان کی شناخت اس کے پیشے سے نہیں ذاتی خصوصیات کی بنا پر کرنے کے خواہاں ہیں۔ 'سبزہ زہر اب' میں رشید امجد خود کو ایسے کٹہرے میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ جہاں وہ خود کو موجود اور ناموجود کے درمیان پاتا ہے۔ اسے اس بات کا احساس ہے کہ وہ زندہ تو ہے لیکن ارد گرد کا ماحول

اس سے زندگی کا حق ختم کر چکا ہے۔ اس کی حیثیت مردہ جسم کی مانند ہے جو حرکات وسکنات سے عاری ہے۔ اس پر زندگی اور موت کی کیفیات حاوی ہیں۔ وہ تذبذب کا شکار ہے کبھی زندگی کو اہمیت دیتا ہے اور ساتھ زندگی کی بے معنویت اس پر حاوی ہو جاتی ہے۔ رشید امجد سائنس اور فلسفہ دونوں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتے ہیں۔ حیات اور بعد حیات کا تصور سائنس اور فلسفے کی بحث میں سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

" ہر شخص اپنے ڈی این اے کا تصویری وجود ہے۔ جب یہ تصویر دھندلی ہوتی ہوتی مٹ جاتی ہے تو ڈی این اے پھر بھی موجود رہتا ہے۔ تو کیا وہ اب صرف اپناڈی این اے ہے جس کے بارے میں اُس نے کبھی پڑھا تھا کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ تو کیا اس کی تصویری حیثیت ختم ہو گئی ہے "۔ (۵)

رشید امجد اس افسانے میں انسان کو ایسے دہرائے پر کھڑا پاتے ہیں جہاں انسان سانسیں تو لے رہا ہے لیکن اس کی زندگی بے معنی ہو چکی ہے۔ سماجی رویوں نے انسان کو تنہا اور ٹوٹ پھوٹ سے دوچار کر دیا ہے۔ انسان کی اہمیت اس کی زندگی کی دلیل ہے۔ ورنہ مرے ہوئے اور زندہ میں فرق نہیں۔ رشید امجد کے کردار سماجی بے راہ روی کے عکاس ہیں۔ جہاں انسان کی قدر و منزلت کا تعین مادیت پرستی کی بدولت قائم ہے۔

"تو کیا وہ اس لئے نظر انداز کر رہے ہیں کہ اب وہ ان کے لئے صرف ایک عام باپ اور بیوی کے لئے عام شوہر ہے۔ ان کی ضرورتوں کا خدا نہیں، اس کے حاکمانہ ٹھاٹ کا زمانہ گزر چکا۔ تو کیا بات صرف اتنی سی ہے یا پھر وہ واقعی اپنی تصویری حیثیت ختم کر چکا ہے اور اب صرف ڈی این اے ہے جو اپنا وجود تو محسوس کرتا ہے، دوسروں کو اپنے ہونے کا احساس نہیں دلا سکتا"۔ (۶)

مشینی دور میں انسان کی حیثیت بھی ایک مشین کی سی ہے۔ اب انسان کی جگہ مشینوں نے لے لی ہے۔ جہاں ایک کام انسان کرتا تھا اب اس کی جگہ مشینیں انسان کو بے دخل کر کے استعمال میں لائی جارہی ہیں۔ گویا انسان کی اہمیت میں کمی کے باعث اسے بے دخل کر دیا گیا ہے اور جدید دور میں اس کی نفی ایک عام رویہ بن چکا ہے۔ جب تک کار آمد تھا تو اس کے وجود کی بقا تھی ورنہ بے کار۔ جدید دور کا یہ المیہ ہے کہ انسان کے وجود کا احساس ضروریات پوری کرنے کی حد تک ہے۔ رشید امجد گھر گھر کی کہانی بتاتے ہیں کہ حیاتی کا جبر کس حد تک

انسان پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ اور اولاد کا برسر روزگار ہو جانے کے بعد فرد کی گھر میں وہ اہمیت نہیں رہتی جو پہلے ہوتی تھی۔ وہ خود کو زندہ تو تصور کرتا ہے لیکن صرف سانسوں کی پھنکار تک۔ ورنہ اس کے وجود کے ہونے کا فائدہ نہیں۔ سماجی ماحول سے زندگی تغیر کا شکار رہتی ہے۔ جدید دور میں بھی مشینی ماحول نے انسان کو اپنے جیسا بنا لیا ہے۔ افسانہ 'سبزہ زہراب' جبری صورتحال کو سامنے لاتا ہے جو انسان کے خارجی اور داخلی عوامل سے منسلک ہے۔

رشید امجد اپنے افسانوں میں علامتوں سے کام لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زماں و مکاں کا تصور انسانی زندگی کے جبر کی وضاحت کرتا ہے۔ ہر انسان اپنے زماں اور مکاں کے دائرے میں مقید ہے۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی مچھلی کے ایکیوریم کی مانند ہے۔ جہاں مکاں تو سب مچھلیوں کا ایک جیسا ہے لیکن زماں الگ الگ۔ کسی کی عمر زیادہ ہے اور کسی کی کم۔ ہر شخص اپنے مکان میں مقررہ زماں پورا کر کے دوسری دنیا میں چلا جاتا ہے۔ انسان کی منتقلی کسی اور طاقت کے ہاتھ میں ہے جہاں انسان بے بس ہے۔ انسان پر یہ جبر مسلط کیا گیا ہے تا کہ یہ خود مختار نہ ہو سکے۔ رشید امجد کے افسانوں میں اسی تناظر میں فلسفہ حیات و ممات کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔

> " ان مچھلیوں کو نہیں معلوم کہ ان کی دیکھ بھال کرنے والی غیبی قوت کون سی ہے۔ دوسری مچھلی مری تو اسے جالی میں ڈال کر کوڑے کے ڈرم میں پھینکتے ہوئے خیال آیا کہ ان کی موت اور زندگی پر میرا اختیار نہیں۔ یہ مر کیوں جاتی ہیں ؟ کیا انہیں کوئی بیماری لگ جاتی ہے یا اپنی طبعی عمر کو پہنچ جاتی ہیں"۔ (۷)

'رائیگاں کی دھول' فرد کی بے بسی اور بے کسی کی عمدہ مثال ہے۔ علامتی انداز میں لکھا گیا یہ افسانہ فرد کے بے اختیار ہونے کی دلیل ہے۔ یہ کہانی انسانی زندگی کے بچپن سے آخر تک کا احاطہ کرتی ہے۔ جس میں انسان کے پاس اختیار نہیں کہ وہ خود کو عمر کے کسی حصے میں روک سکے۔ زندگی درجہ بدرجہ اپنی مدت پوری کرے گی۔ فرد اپنی حیات کے دورانیے سے بھی آگاہ نہیں۔ زندگی خود بخود گزر رہی ہے، گزرتی رہے گی۔ یہ جبریت اور اختیاریت کے افتراق کو واضح کرتی کہانی ہے۔

> " یہی سارا کھیل ہے۔ اس نے سوچا زندگی کا تسلسل بھی شاید یہی ہے لیکن ہماری مرضی کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔

ایک ایکویریم سے دوسرے ایکویریم۔۔۔ مرجائیں تو بھی ایک ایکویریم سے دوسرے میں۔۔۔"میں اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہوں اور میری حیثیت کیا ہے؟"۔ (۸)

فلسفۂ حیات وممات اس کہانی کا بنیادی موضوع ہے۔ یہ فلسفہ رشید امجد کے ذہنی خلفشار کو بڑھا دیتا ہے۔ بے بسی اور افسردگی فرد کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ ایک زماں سے دوسرے زماں میں منتقلی فرد کی بے اختیاری کی دلیل ہے۔ فرد کی مرضی کے مطابق زندگی نہ رک سکتی نہ جلدی گزر سکتی ہے۔ رشید امجد کے ارتقائی عمل میں سوچ کی نئی راہیں سامنے آتی ہیں۔ فرد جس زندگی سے گزر رہا ہے، وہ اس کا خواہاں نہیں، لیکن اپنی مرضی سے جینے کا بھی اختیار نہیں۔ زندگی کی کشتی چلتی رہے گی اور ایک دریا سے دوسرے دریا میں خود بخود پہنچ جائے گی۔ بس جو ہوگا وہ ہو کر رہے گا۔ آگے کیا ہوگا، کیسا ہوگا، رشید امجد کے افسانے ان کیفیات سے بھرپور ہیں۔

ii. سیاسی/سامراجی جبر

سامراج حکومت کا نمائندہ ہے۔ نمائندگی کرنا اس کا پیشہ ہے۔ لیڈر کے بجائے مینیجر کا کردار ادا کرتا ہے۔ نمائندگی، پیشہ وری یا مینیجری سامراج کی وہ خصوصیات ہیں جو اسے قوت دیتی ہیں۔ یہ قوت کسی ایک حاکم کے ذریعے پورے سماج میں اپنے پنجے گاڑتی ہے۔ سیاسی نظام اس کی عمدہ مثال ہے۔ جس میں سامراج کو نمائندگی حاصل ہے۔ سامراجیت سیاسی تناظر میں جبریت کی ایسی شکل ہے جس نے پورے سماج کو اپنے حصار میں لیا ہوتا ہے اس حصار کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ سامراجی نظام ایک فرد کی شناخت، اس کی ثقافت، تہذیب، معاشرت، معاشی نظام اور اقدارِ زندگی کو ایک ایک کرکے اپنے حصار میں لے لیتا ہے اور بالآخر پورے سماج اور اس میں رہنے والوں کو حتی کہ پورے خطے کو محکوم بنا دیتا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ فاشزم (فسطائیت) ہے۔

رشید امجد کے افسانوی مجموعے "دکھ ایک چڑیا ہے" کا آغاز ایک ایسے افسانے سے ہوتا ہے جس میں پس پردہ سیاسی و سامراجی جبر کو اجاگر کیا گیا ہے۔ سماجی ڈھانچے میں بہت سے ادارے کام کرتے ہیں۔ ان اداروں پر سیاسی سسٹم کس حد تک حاوی ہے "حسرت چشیدہ" میں نشاندہی کی گئی ہے۔ سیاست دان، جاگیر دار اور بااثر افراد بیوروکریسی کے ساتھ گٹھ جوڑ کرکے اپنے غیر قانونی مقاصد کو پورا کرتے ہیں۔ اداروں میں اوپر

سے نیچے آرڈر پاس ہوتے ہیں۔ پورا سسٹم کرپشن کی زنجیر میں جڑا ہوتا ہے۔ ایسے سماج میں کسی ایماندار شخص کی انفرادیت کو دبا دیا جاتا ہے۔ اداروں میں ایماندار عہدار کو سسٹم سے باہر کیسے کیا جاتا ہے اس افسانے میں بتایا گیا ہے۔

> "ہر کام مرضی کے خلاف کرنا پڑتا، یہ مرضی اس کی ذاتی نہیں تھی، اُصولی تھی۔ اگلے ہی دن میٹنگ میں جب اس نے ایک پروجیکٹ کی منظوری کے حوالے سے اعتراض اٹھایا تو سیکرٹری نے اشارے سے اسے منع کیا۔۔۔اس کے مسلسل اختلاف اور دلائل کے باوجود اس پروجیکٹ کو منظور کر لیا گیا"۔ (۹)

'حسرت چشیدہ' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں رشید امجد سماجی منفی رویوں کو صحیح معنوں میں اجاگر کرتے ہیں۔ سماج میں بڑے لوگوں سے مراد ایک طبقہ سیاست دانوں کا بھی ہے جو ذاتی مفاد کے لئے جبرًا غیر قانونی کام کرواتے ہیں۔ رشید امجد اپنے افسانوں میں عام آدمی کے درد کو صرف بیان نہیں کرتے بلکہ اس کے محرکات کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ کرپشن زدہ سماج میں عام آدمی کی زندگی اجیرن بن چکی ہے۔ فرد بے حسی، بے بسی اور بے راہ روی کے دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔ کوئی پرسان حال نہیں۔ ہر آنے والا دن آزمائش کا دن ہے۔ رشید امجد معاشرتی نظام کی دیمک زدہ لاٹھی گرتے دیکھ رہے ہیں۔

> "اُس نے پھر کچھ کہنا چاہا تو وہ بولے، 'میں تمہیں پسند کرتا ہوں، جانتا ہوں تم ایک دیانتدار اور محنتی افسر ہو، لیکن بھائی! ہم ایک سسٹم کے پرزے ہیں، اس کے مطابق نہیں چلیں گے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ جاؤ لیٹر جاری کر دو"۔(۱۰)

مذکورہ بالا سماج کا سامراجی پہلو ایک لحاظ سے مادیت پرستی سے بھی جڑا ہے۔ مشینی دور میں انسان کی پامالی اور جنگوں میں انسان کا قتلِ عام اس کی عمدہ مثال ہے۔ اس مادیت پرستی نے اب گھروں کا رخ کر لیا ہے۔ جس نے ایک انسان کو دوسرے انسان سے لاتعلق کر دیا ہے۔ اسی تفرق نے ہمارے تمام سماجی نظامات میں بھی تضادات پیدا کر دیے ہیں اس کی عمدہ مثال معاشی عدم استحکام ہے۔ معاشی عدم استحکام اور عدم مساوات کے پیچھے سیاسی و سامراجی عناصر کار فرما ہوتے ہیں۔ جس سے عام آدمی کی زندگی میں ہمیشہ سہولیات کا فقدان رہتا ہے۔ اس افسانے میں رشید امجد عام آدمی کے گھریلو حالات سے پردہ اٹھاتے ہیں جہاں زندگی کسی حد تک

کسمپرسی کا شکار ہے۔ عام آدمی جب لوگوں کا ٹھاٹ باٹ دیکھتا ہے تو خواہشات کا سمندر ٹھاٹیں مارنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسے سماج میں زندگی جبر و کرب کی صورت میں انسان پر آزمائش بن جاتی ہے۔

"بیوی نے سن کر کچھ نہیں کہا۔ رات کو کھانا کھاتے صرف اتنا بولی، "لوگ آگے جا رہے ہیں، تم پیچھے آ رہے ہو"۔ (۱۱)

سماج کی بنیادیں جب کھوکھلی ہو جائیں تو ناانصافی افراد کا مقدر بن جاتی ہے۔ سیاسی عناصر سماجی ماحول کو درست سمت میں لانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں لیکن یہی عناصر عوامی ترجیحات کی بجائے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ عام آدمی ان سیاسی عناصر کے ہاتھوں کٹھ پتلی کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ جسے جب چاہیں اپنے اشاروں پر نچا لیں۔

سامراجیت کی بالادستی کی بدولت ریاستی قوانین نے انسان کو جبر کی صورتحال سے دوچار کر دیا ہے۔ جدید دور میں بھی ایسے سامراج موجود ہیں جہاں انسان بے بسی اور مجبوری کی زندگی گزار رہا ہے۔ رشید امجد سامراجی قوتوں کے جبر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ایسی اذیت ناک اور درد بھری زندگی کی عکاسی انہوں نے اپنے افسانے 'موسم بہار میں سوکھی ٹہنیاں' میں کی ہے۔ جہاں ایک جوڑا مزدوری کے لئے بیرون ملک جاتا ہے اور پاسپورٹ کفیل کے پاس ضبط ہونے کی بدولت وہ غیر قانونی طور پر رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور چھپ کے شادی کرنا ان کے لئے عذاب بن جاتا ہے جبر و خوف کی زندگی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ سامراجی قانون کے مطابق ان کا نکاح رجسٹرڈ نہیں ہو سکتا۔ جس سے ان کی شادی اور اولاد غیر قانونی تصور ہوتے ہیں۔

" جس دن بچی ہوئی اسی رات میں اسے ہسپتال لے گیا'، وہ بول رہا تھا جیسے سامنے لکھی کوئی تحریر پڑھ رہا ہو۔۔۔ اتفاق سے ڈیوٹی نرس بھی بنگالن تھی۔ جانتی تھی، کہنے لگی " بچی کو لے کر فوراً یہاں سے نکل جاؤ، ورنہ کاغذات مانگے جائیں گے تو دونوں پکڑے جاؤ گے اور حدود کا مقدمہ بن جائے گا"۔ (۱۲)

مصنف اس کہانی میں ایسے کرداروں کی نشاندہی کرتا ہے جو سماج میں جبراً زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایسی ریاستیں ہیں جو غیر ملکی انسانوں کو اپنے شکنجے میں جکڑنے کے قوانین بناتی ہیں اور انسان سے زندہ رہنے کا حق چھین لیتی ہیں۔ یہ افسانہ خارجی جبر کی عمدہ مثال ہے۔ فرد کا لمحہ لمحہ اذیت، کرب اور خوف میں گزر رہا ہے

۔ ریاستی قوانین نے فرد کو غلام بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ رشید امجد کی نگاہ دنیا کے ہر اس سماج پر ہے جہاں جبر کی صورتحال ہے۔

" یہ بچی بیمار ہو جائے تو ہسپتال نہیں جاسکتی، سکول کو بھی نہیں جاسکتی کیونکہ یہ غیر قانونی ہے، پیدائشی غیر قانونی"۔۔۔ذراچپ رہنے کے بعد بولا۔۔۔۔" یہ پکڑی گئی تو ہم دونوں بھی۔۔۔"۔ (۱۳)

سماجی بے حسی، کربناکی اور مردہ دلی رشید امجد کے ہاں خاص موضوع بنتے ہیں جہاں انسان مجبور محض ہے۔ انتشار زدہ ماحول سماج میں افراتفری، فساد اور عدم مساوات کا موجب بنتا ہے۔ رشید امجد کی کہانیاں سماج کی اس ٹوٹ پھوٹ کی عکاس ہیں۔ شر پسند عناصر سماج کی تباہی اور بربادی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ عناصر معاشرے کی گندگی ہیں۔ جن کی بدولت عام آدمی کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔

" اس کے چاروں طرف گٹر تھا۔ گھپ اندھیرے میں آس پاس دیکھنے کی کوشش کی، کچھ دکھائی نہ دیا۔ اوپر شہر ہمہما رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اندھیرے سے مانوس ہوا تو لگا سارا شہر ہی اس کے آس پاس ہے"۔ (۱۴)

گٹر اور شہر کی علامتیں اکثر رشید امجد کے افسانوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ اس کہانی میں بھی گٹر تاریک، گندے اور بدبودار سماج کی علامت بنتا ہے۔ ایسا سماج جہاں انسانی زندگی کی اہمیت نہ ہو اور عام آدمی بڑے لوگوں کے سامنے جانور کی حیثیت سے بھی کمتر ہو۔ رشید امجد ایسے ماحول کو گٹر کا درجہ دیتے ہیں۔ ہمارے سماج میں سیاسی لوگ ایسی صورتحال پیدا کر دیتے ہیں جہاں زندگی کی معنویت ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں زبانیں بند اور ہاتھ باندھ دیے جاتے ہیں تاکہ لوگ آزادی رائے کا اظہار نہ کر سکیں۔

"تو کیا ہم سب گٹر میں ہیں؟' اس نے سوچا، "اور شہر، شہر کہاں گیا؟"

یہ گٹر ہے یا شہر، شہر ہے یا گٹر۔۔۔کچھ سمجھ نہ آیا۔"۔ (۱۵)

ذاتی مفاد پرستی کی آڑ میں انصاف کی دھجیاں اڑادی جاتی ہیں۔ منصف خرید لئے جاتے ہیں۔ دھاندلی کر کے حق مار دیا جاتا ہے۔ بندوق تان کے عزت لوٹ لی جاتی ہے۔ ووٹ کی جگہ نوٹ کو اہمیت دی جاتی ہے۔ کرسیاں بِک جاتی ہیں۔ رشید امجد ان تمام تلخ حقائق کو گٹر سمجھتا ہے جہاں گندگی میں سب برابر ہیں۔

iii. معاشی جبر

معاشی ضرورتوں کے باعث انسان ایک دوسرے سے منسلک ہے۔ سماج میں معاشی عدم استحکام سے انسانی زندگی بہت متاثر ہوئی ہے۔ انسان ایک سماج سے دوسرے سماج میں معاشی خوشحالی کے لئے جاتا ہے۔ لیکن اس منتقلی کے نتیجے میں بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں۔ ان مسائل سے تضادات کا جنم لینا فطری ہے۔ جن کی بنیاد معاشی جبر ہے۔ معاشی جبریت کے نتیجے میں سب سے بڑا مسئلہ خاندان کا بٹ جانا ہے۔ بڑھاپے میں والدین جو سہارے کے محتاج ہوتے ہیں ان کی اولاد اپنے مستقبل کی بہتری کے لئے انہیں چھوڑ دیتی ہے اور والدین نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں اپنے سے دور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وِل ڈیورانٹ خاندانی بدحالی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

> "خاندان جو کبھی اخلاق کی تربیت گاہ اور سماجی نظام کی بنیاد تھا، شہری صنعت کی ذاتیت میں گم ہو گیا ہے اور ہر نسل کے بعد پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ اولاد کی عافیت کے لئے جانفشانی سے بنائے ہوئے مکان خاموش اور ویران ہیں۔ بچے، پریشان مقصدوں میں الجھے ہوئے، والدین اپنے اداس گھروں میں تنہا اور کمرہ آشنا آوازوں کی غیر موجودگی سے گونجتا ہے"۔ (۱۶)

رشید امجد اپنے افسانوں میں ایسی زندگی کو منظر عام پر لاتے ہیں جہاں معاش نے رشتوں میں دوریاں پیدا کر دی ہیں۔ جن کی بدولت سماج جبری صورتحال سے دوچار ہے۔ جس سے سہولتوں کا فقدان، بے روزگاری معاشی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ رشید امجد زندگی کی بے معنویت کو حقائق کی روشنی میں اپنے افسانوں کا حصہ بناتے ہیں۔ ان کے ہاں ماں باپ کا کرب، تڑپ اور جبر نا قابل برداشت حقیقت ہے۔ یہی صورتحال ان کے افسانے 'شام کہانی' میں نظر آتی ہے۔

"اس کا چھوٹا بیٹا تو پہلے ہی دبئی میں تھا، شادی کے بعد وہ اپنی بیوی کو بھی وہیں لے گیا، وہیں اس کے دو بچے ہوئے اور اب وہ وہاں کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ تیسرا بیٹا، اس کے ساتھ تھا، اس کی بیوی اور بیٹی بھی ساتھ تھیں، اب یہ پوتی ہی ان کی محبتوں کا مرکز تھی، پندرہ دن پہلے کھانا کھاتے ہوئے بیٹے نے گویا اطلاع دی۔ مجھے ملائیشیا میں جاب مل گئی ہے۔ شاید اگلے ہفتے جانا ہو۔

لقمہ اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ "اور یہ۔۔۔۔"

یہ دونوں بھی ساتھ جائیں گی"۔ (۱۷)

رشید امجد سماجی رویوں اور ان کے نتائج کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ ان کی کہانیاں آپ بیتی محسوس ہوتی ہیں۔ فرد خود کو اور بچوں کو اکٹھے رہنے اور جوڑنے کے لئے زندگی وقف کر دیتا ہے لیکن پھر اسے یہی بچے جوان ہو کر تتر بتر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ رشید امجد خود سے سوال کرتا ہے، ایسا کیوں؟ کیا ان کو سکون کا حق نہیں؟ یہ جبر اس کا ہی مقدر کیوں؟

"بیٹے نے بات سمجھ لی بڑے رسمی انداز میں بولا "تو چار چار مہینے کر لیں چار میرے پاس، چار چھوٹے کے پاس اور چار یہاں، ملازم تو ہو گا ہی۔ اچھا ہے یہاں بھی میل ملاپ رہے گا"۔ (۱۸)

ڈاکٹر صفیہ عباد لکھتی ہیں:

"مشترکہ خاندانی نظام تلاش روزگار کی بہانہ جوئی میں گھر کی چوکھٹ بانٹ رہا ہے۔ یہ رشید امجد کی کہانی کا وہ سچ ہے۔ جو ہر گھر کی کہانی اور اس کے در و دیوار کی سنسانی کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ تنہائیوں کی موت مرتا ہوا بڑھاپا صرف محسوس کر سکتا ہے کچھ کہہ نہیں سکتا"(۱۹)

رشید امجد سماج میں خاندانی ٹوٹ پھوٹ اور کربناکی کو اپنے افسانوں میں بیان کرتے ہیں۔ جب رشتوں میں فاصلے بڑھ جائیں تو زندگی کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ انسان مجبوراً ایسے فیصلے کر لیتا ہے جو اس کی مرضی کے خلاف ہی کیوں نا ہوں۔ یہ افسانہ جدید دور کی گھر گھر کی کہانی ہے۔

"دوست چند لمحے چپ رہا پھر بولا۔۔۔ "ہمیں حقیقت کا سامنا کرنا چاہئے۔ اپنے بچوں کے مستقبل کو قربان نہیں کرنا چاہئے، اور پھر یہ کوئی نئی بات نہیں، کون ہے جسے موقع ملے اور وہ باہر نہ جائے"۔[۲۰]

واحد متکلم 'وہ' کا کردار رشید امجد کے افسانوں میں بہت مضبوط کردار ہے۔ یہ کردار بیک وقت کئی روپ دھار لیتا ہے۔ چلتے چلتے ایسے پلٹی کھاتا ہے کہ سمت تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر یکدم اپنی سمت میں لوٹ آتا ہے۔ ان کے افسانے 'مٹی کی مہک' میں بھی اس کردار نے دو مختلف فلیٹ زدہ زندگی کی عکاسی کی ہے۔ جسے اپنے ملک کے فلیٹ میں اور بیرون ملک فلیٹ میں بہت فرق نظر آتا ہے۔ اپنے ملک کے فلیٹ میں زندگی معاشرتی رشتوں سے کسی نہ کسی طرح منسلک تھی، آس پاس کے مکین، بچوں کا کھیل کود وغیرہ جبکہ بیرون ملک کے فلیٹ تو بس سوائے قید خانے کے کچھ نہیں۔ ساتھ کون ہے کسی کو معلوم نہیں۔ ہر شخص مشین بنا ہوا ہے، معمول کے دائرہ میں گھوم رہا ہے۔ لیکن اسے یہاں معاشی تنگدستی کا سامنا نہیں رہا، اندر ہی اندر کا ماحول اسے قیدی بنانے لگا اور یوں وہ اپنی ذات کا اسیر بن گیا۔

"پھر یوں ہوا کہ اچھے روزگار کی تلاش میں وہ اپنے ملک سے نکل کر یہاں آ گئے۔ ہاتھ تو کھل گیا لیکن دل بند ہونے لگا"۔[۲۱]

اس کہانی میں فرد کے احساسات و جذبات کو مختلف زاویوں سے دکھایا گیا ہے۔ فرد معاشی استحکام کے لئے بیرون ملک ہجرت کرتا ہے، مالی حالات تو مستحکم ہو جاتے ہیں لیکن ایک خلا ہے جو خالی رہتا ہے۔ وہ اپنے وطن سے لگاؤ ہے۔ انسان جتنا بھی غیر ملک میں خوشحال زندگی گزار لے، اپنے ملک کی اپنائیت کم نہیں ہوتی۔ لیکن مجبوریوں نے واپسی کی راہیں بند کر دی ہیں۔ چاہتے ہوئے بھی واپسی ممکن نہیں۔ کاروبار، اولاد، گھر سب کچھ چھوڑ کر واپس آنا مشکل ہو گیا ہے۔

"ایک دن باپ کی خاموشی ٹوٹ گئی، صبح ناشتہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "ہم نے کافی پیسے جمع کر لئے ہیں، واپس کو نہ چلیں؟"

لگا جیسے کائی زدہ تالاب میں کسی نے بڑا سا پتھر پھینک دیا ہو،

آنکھوں میں چمک سی آئی لیکن اگلے ہی لمحے وہی پتھراؤ، بڑے بیٹے نے کہا۔ "ہمیں تو اب یہاں کی شہریت ملنے والی ہے"

بیٹی بولی۔ "میں تو کبھی نہ جاؤں؟"۔ (۲۲)

یہ افسانہ معاشی تناظر میں دو نسلوں کی ترجیحات کو سامنے لاتا ہے۔ بیٹا اور بیٹی بیرون ملک کی زندگی سے خوش ہیں۔ وہاں مستقل سکونت کے خواہشمند ہیں۔ یہی نئی نسل کی خواہشات ہیں۔ لیکن والدین کو اپنا وطن پسند ہے۔ وہ بیرون ملک مستقل سکونت سے بیزار ہیں۔ دو نسلوں کی تکرار سے جبری حالات پیدا ہوتے ہیں۔ جس میں کسی نہ کسی کو جبری زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ معاشی جبر نے محبتوں میں جڑے بندھنوں کو کمزور کر دیا ہے۔ رشید امجد رشتوں کی پامالی کی بنیادی وجہ مال و دولت کی ہوس قرار دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کا دکھ درد سمجھنا مشکل ہو گیا ہے۔ ذاتی مفاد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ایک وقت تھا جب گھر کا ایک سربراہ ہوتا تھا۔ سب اس کے کنٹرول میں تھا، تب رشتے بھی مضبوط ہوتے تھے۔ جدید دور نے ہر فرد کو سربراہ بنا دیا ہے۔ رشید امجد ایسی زندگی کو اپنے افسانوں میں بہ خوبی اجاگر کرتے ہیں۔

iv. میکانکی جبر

رشید امجد کے افسانوں میں واحد متکلم کردار پہلے اپنے حالات سے آگاہ کرتا ہے، اپنی محنت، جمع پونجی اور درجہ بدرجہ زندگی کی کتاب کھولتا ہے۔ یہ اس کردار کی خوبی ہے کہ وہ چھلانگیں نہیں پھلانگتا بلکہ قدم بہ قدم چلتا ہے۔ رشید امجد کی خوبی یہ ہے کہ وہ خیال سے نئے خیال، واقعے سے نئے واقعے میں سفر کرتے ہیں اور کہانی کی بنت بنتی جاتی ہے۔ ایک افسانے میں کئی موضوع سامنے آتے ہیں اور ان موضوعات کا تانا بانا ایسا جڑا ہوتا ہے کہ کہانی کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔ جدید دور میں سائنسی ترقی نے رشتوں کو تھامنے کی سہولتیں بھی دی ہیں لیکن ان کی بدولت رشتوں میں فاصلے بڑھ چکے ہیں۔ انٹرنیٹ، کمپیوٹر، موبائل نے بیرون ملک میں بیٹھے اپنوں کو سکرین پر آمنے سامنے بٹھا تو دیا ہے لیکن دلوں کو دور کر دیا ہے۔ مشینی ترقی انسانی زندگی کو مشینی بنا رہی ہے جس میں سماجی فاصلے بڑھ رہے ہیں۔ بوڑھے والدین اب اسی انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب ان کی اولاد آن لائن ہو گی اور وہ ان سے بات کریں گے۔ یہ دور حاضر کا ایسا جبر ہے جس نے زندگی کا سکون چھین لیا ہے۔ انتظار، امید میں دن رات کٹھن ہوتے جاتے ہیں۔

"اس کی اداسی دیکھ کر بیوی بولی۔ "اب کیا مسئلہ ہے، پہلے تو مہینوں کسی کی خبر نہیں ملتی تھی، اب تو نیٹ ہے، باتیں بھی کر لیں اور ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیں"۔ (۲۳)

رشید امجد 'گماں کے رشتے' میں میکانکی جبر کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں زندگی کی رنگارنگی سکرین کے پردے پر نہیں بلکہ حقیقی میل ملاپ سے ہے۔ مشین نے انسان کو انسان سے بہت دور کر لیا ہے۔ بظاہر قریب سے نظر آنے والے نہ جانے کتنی صدیاں دور ہوتے جا رہے ہیں اور ایک وقت آئے گا جب صرف موبائل پر سلام دعا ہوا کرے گی۔ سماج اس مشینی دور سے کس طرح نبرد آزما ہو گا، رشید امجد اس سوال کا جواب ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ جدید ترقی سے سماج سہولتوں سے تو بہرہ مند ہوا ہے لیکن رشتوں میں جذبات واحساسات کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ ہر کام رسمی ہو رہا ہے۔

"اس نے سوچا۔ "شاید فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے"

اب جب بھی نیٹ کھلتا۔ "بیٹی اپنے بیٹے کو کہتی۔ 'کہو نانا۔ نانا"۔ (۲۴)

اس افسانے میں جدید دور کے تقاضوں کو زیر بحث لایا گیا ہے، جس میں مرکزی کردار کی پہلے بیٹی اور پھر بیٹا شادی کر کے بیرونِ ملک چلے جاتے ہیں۔ والدین انٹرنیٹ کے سہارے بے سہارا چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ ہر روز پوتے اور نواسی سے مقررہ وقت پر بات ہوتی۔ بظاہر یہ دوری دوری نہیں تھی۔ روزانہ ویڈیو کال ہوتی۔ لیکن جب وہ ملنے کے لیے ان کے پاس آئے پہچان ہی نہ سکے جنہیں روزانہ دادا، نانا کہہ کر پکارتے تھے۔ رشید امجد اس کہانی میں سماجی استحصالی پر نوحہ کناں ہیں۔ جدید زندگی اب اسی طرزِ زندگی پر گامزن ہے۔ اب تو گھر میں ہر شخص کے پاس موبائل فون ہے۔ تمام ہر وقت موبائل پر مصروف ہیں۔ میکانکی ترقی نے باہمی تعلق کو بکھیر دیا ہے۔

" یہ تو ہمیں پہچانتے ہی نہیں "اس نے روہانسی آواز میں بیوی سے کہا اور سوچا۔
رشتے صرف کاغذوں میں نہیں ہوتے، فاصلے بھی اہم ہوتے ہیں"۔ (۲۵)

مرشد کا کردار رشید امجد کی کہانیوں میں بہت اہمیت کا حامل ہے، ہر موڑ پر مرشد کی رہنمائی نئے زاویے دکھاتی ہے۔ اس کے سوالوں کے جواب مرشد دیتا ہے۔ رشید امجد 'گماں کے رشتے' میں انسانی زندگی کو دنیا کی سکرین پر نظر آنے والی تصویر سے تشبیہ دیتے ہیں اور اصل کہیں پیچھے ہے۔ مرشد اور اس کی گفتگو فلسفیانہ

تفکر کی حامل ہے جس میں دنیاوی زندگی صرف چند لمحوں کی مہمان ہوتی ہے، ابدی حیات کہیں اور ہے۔ سکرین جدید سائنس کی ایجاد ہے۔ یہ دنیا کے ظاہری پن کی علامت ہے۔ جو نظر آتا ہے وہ سکرین ہے لیکن اس کے پیچھے کیا مخفی ہے۔ اسے ہائپر ریئلٹی (اضافی حقیقت یا حقیقت کی اضافیت) بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کی کسی کو خبر نہیں۔ اس نقطۂ نظر سے بھی ان کے ہاں موضوعات کی کثرت ہے۔ رشید امجد فلسفہ زندگی کو سائنسی تناظر میں پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

v. مذہبی / ثقافتی جبر

مذہبی اختلافات اور فرقہ پرستی کی وجہ سے سماج میں مذہبی جبر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بین المذاہب و بین المسالک ہم آہنگی کا فقدان جبریت کو فروغ دیتا ہے۔ مذہب کے نام پر فسادات نے سماجی نظام کو تہس نہس کر دیا ہے۔ مذہبی آڑ میں دہشت گردی کی وجہ سے عام آدمی کی زندگی مشکل کا شکار ہے۔ لوگوں کا ایک دوسرے پر بھروسہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ مذہب کا سہارا دشمن عناصر لیتے ہیں تا کہ ایک خاص سماج میں بدامنی کی فضا قائم کی جا سکے۔ ان عناصر کی پہچان عام آدمی نہیں کر سکتا کیونکہ انہوں نے اس سماج کے مذہب کا لبادہ اوڑھا ہوتا ہے۔ انسان کی زندگیوں سے کھیلنا معمول بنتا جا رہا ہے۔ رشید امجد ایسی صورتحال میں عام آدمی کی منتشر زدہ زندگی کے عکاس ہیں۔ ان کے افسانے بیک وقت کئی موضوعات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانے 'شہر گریہ' میں دہشت گردی اور اس کی وجہ سے عام آدمی پر اثرات کو اجاگر کیا ہے۔ یہ ایسی کہانی ہے جس میں سفید داڑھی اور جنت کو علامتی پیرائے میں دکھایا گیا ہے۔ جنہیں مذہب کے حوالے سے استعمال کیا گیا ہے۔ نائن الیون کا حادثہ اتنا جان لیوا نہیں تھا لیکن اس کے اثرات نے ان گنت جانیں لیں۔

> "چوک پر سگنل بند ہوا تو گاڑی رکی، اگلا دروازہ کھلا رہ گیا تھا، پلک جھپکنے میں ایک سفید ریش آدمی دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، سفید ریش نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا اور بولا، "اللہ نے تمہیں جنت کے لئے چن لیا ہے، جدھر میں کہتا ہوں خاموشی سے چلتے رہو ورنہ۔۔۔"[۲۶]

اس افسانے میں رشید امجد نے دہشت گرد عناصر کی اصل تصویر سامنے لائی ہے، یہ عناصر ملک دشمن بھی ہوسکتے ہیں، فرقہ پرست اور مذہبی انتہاپسند بھی۔ یہ ایسا المیہ ہے کہ بظاہر کسی کو پہچانا نہیں جاسکتا۔ یہ ہمارے سماج میں عام آدمی کی طرح چھپے ہوتے ہیں۔ اپنے مقاصد کے لئے مذہبی روپ اختیار کرنا کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن اس کی وجہ سے عام آدمی کی زندگی کو جو خطرہ لاحق ہے، اس کا مداوا کرنا مشکل ہے۔ سماج انفرادی و اجتماعی سطح پر مشکوک نظر آتا ہے۔ ملکی حالات نے ایسا تاثر دیا ہے کہ داڑھی والا دہشت گرد ہے۔ رشید امجد ایسے حالات کو اپنی کہانیوں میں دکھاتے ہیں۔ مذہبی آڑ میں کون کیا کر رہا ہے، اس کی شناخت کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

> "سفید ریش کے کہنے پر دو تین موڑ مڑ کر ممنوعہ سڑک پر بڑھنے ہی والا تھا کہ سفید ریش کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ وہ کچھ دیر سنتا رہا پھر بولا۔ "واپس مڑو شاید تمھارے نصیبوں میں جنت نہیں، پروگرام بدل گیا ہے، اگلے موڑ پر مجھے اتار دو اور خبر دار! پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا"۔[۲۷]

رشید امجد جبر کا ایسا منظر نامہ پیش کرتے ہیں کہ سماج ذہنی طور پر مفلوج ہو چکا ہے۔ دھماکے، خون اور قتل و غارت نے انسانوں میں بے اعتمادی کو فروغ دیا ہے۔ عام آدمی کے لئے سکون اور امن ختم ہو چکا ہے۔ کردار یہ بتاتا ہے کہ اب سماج میں کوئی کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کہیں پر قانون کی بالا دستی نظر نہیں آتی۔ یہ افسانہ موجودہ سماج کی شکستگی کا نمائندہ ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ نیکی کرنا وبال جان بن سکتا ہے۔ عدم اعتبار کی فضا بڑھ چکی ہے۔ نظر آنے والا ہمدرد ہے یا سر درد، یہ جانچنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ وہ حلیہ ہے۔ جو سامنے ہے۔ پس پردہ کون ہے؟ معلوم نہیں۔ رشید امجد ایسے سماجی بہروپ سے خبر دار کرتے ہیں۔ جو کہ سوائے احتیاط کے ممکن نہیں۔

> "اس طرح اب کئی لوگ جنت میں جانے پر مجبور تھے۔ بس احتیاط ہی تھی کہ گاڑی کے دروازے بند رکھو، کسی کو لفٹ نہ دو، لیکن کسی بھی جگہ کوئی اور کہاں ہے، یہ کسے معلوم؟[۲۸]

'شہر گریہ' ہر اس عہد کا نمائندہ افسانہ ہے جہاں مذہبی آڑ میں عام لوگوں کا استحصال کیا جاتا ہے، جنت کی بشارت انسان کو انسان کے خلاف ایک آلہ کے طور پر استعمال کی جارہی ہے۔ سادہ لوح انسانوں کے

دماغوں کو اپنے مقاصد کے لئے تیار کیا جاتا ہے جس کے نتائج دہشت گردی کی صورت میں نکلتے ہیں۔ایسی جنت کا وجود کہاں ممکن ہے جو بے گناہ لوگوں کی لاشوں سے ملے، جو نسلوں کی تباہی سے ملے۔رشید امجد اس افسانے میں عام آدمی کو احتیاط برتنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ سماج کا ایک طبقہ اپنے بچوں کو ایسے مدرسوں میں بغیر تصدیق کے چھوڑ آتا ہے۔جہاں ذہنوں کی مذہبی آڑ میں دہشت گردی اور شر پسندی کی تربیت کی جاتی ہے۔لوگ غربت کی وجہ سے بچوں کو چھوڑتے ہیں اور اسی مجبوری کا فائدہ تخریب کار اٹھا لیتے ہیں۔رشید امجد فرد کو اس فریب سے نکلنے کی راہ دکھاتے ہیں۔ سماج کی بہتری اسی میں ہے کہ بچوں کو ایسے تخریب کاروں سے بچائیں اور خود بھی بچیں۔یہ جدید دور کی تلخ سچائی ہے جو رشید امجد کی کہانی کا موضوع بنتی ہے۔

سماج اور ثقافت کا گہرا تعلق ہے، یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ سماجی ادارے ثقافت کو فروغ دیتے ہیں جس سے زندگی کا تسلسل قائم رہتا ہے۔ہر سماج کے اپنے رسوم و رواج، روایات اور ضابطے ہوتے ہیں جن سے کنارہ کشی ممکن نہیں ہوتی۔ فرد کے لئے ثقافتی اقدار کی پاسداری لازمی ہے۔ ہر سماج میں منفی و مثبت رویے پائے جاتے ہیں جو ہمارے کلچر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب 'تاریخ کی شکستگی' میں سماجی رویوں پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں کہ سماجی رویے کسی بھی معاشرے کی پہچان ہوتے ہیں ان رویوں کی بدولت یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سماج میں تہذیب و تمدن کن مراحل پر ہے۔[۲۹] جدید زندگی میں ثقافتی اقدار بدل رہی ہیں۔ فرد کی زندگی میں نئے رسوم و رواج کا اضافہ ہو رہا ہے۔ فرد جبراً ثقافتی اقدار کی تبدیلی کو قبول کر رہا ہے۔رشید امجد جدید زندگی سے وابستہ جبری صورتحال کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتے ہیں۔ انہوں نے سماج کے بدلتے منظر نامے کو علامتی اور تجریدی انداز میں سامنے لایا ہے۔ بنیادی تبدیلی مشترکہ خاندان کی روایت کا خاتمہ ہے۔جدید دور میں ذاتی مفاد کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ مشترکہ خاندان کا دور ختم ہوتا جا رہا ہے۔اس تبدیلی کا منظر نامہ رشید امجد نے اپنے افسانے "تصویریں اور دیواریں" میں دکھایا ہے ۔ جہاں گھریلو ماحول میں ہلچل والدین کے لے لئے تشویش کا باعث بنتی ہے۔ یہ سنگدلی اور بے مروتی کی عکاس کہانی ہے جس میں اولاد اپنی بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہنے کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔ہمارے سماج میں والدین سے دوری کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

"محبتوں اور چاہتوں کی فضامیں کچھ گڑبڑ ہونے لگی ہے طوفان سے پہلے پرندے فضامیں اڑنے لگتے ہیں اسے لگ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے، اندر ہی اندر کچھ ہو رہا ہے۔ کچھ دن توچپ رہا پھر وہ رہ نہ سکا اور بیوی سے کہا۔ "فضا کچھ بدلی بدلی لگ رہی ہے"(۳۰)

مشرقی کلچر کا یہ خاصہ رہا ہے کہ ان کے بزرگ گھر کے حالات سے آگاہ رہتے ہیں، اس افسانے میں اکٹھے رہنے کی جو روایت تھی وہ محبت اور چاہت کی بدولت تھی لیکن جدید دور کی فضانے کلچر کو تبدیل کر دیا ہے اور نئی روایات کو جنم دیا ہے۔ رشید امجد اپنی فنی و فکری مہارت کی بدولت ایسی جبری صورتحال کو بہ خوبی اجاگر کرتے ہیں۔

"باہر جابیں ڈھونڈ رہے ہیں، میں نے دونوں کی باتیں سن لی تھیں، ایک دوسری کو کہہ رہی تھی، یہاں سے جان چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ باہر نکل چلیں"۔(۳۱)

رشید امجد جدید زندگی کے نباض ہیں۔ انہوں نے جدید دور کی روایات کو حقیقی معنوں میں بیان کیا ہے۔ نئی روایات ہمارے سماج کا حصہ بن گئی ہے ان میں سے ایک شادی کے بعد بچوں کا کسی بھی طرح الگ رہنے کا ماحول بنانا شامل ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ملک سے باہر جانے کا بہانہ ہو یا کوئی بھی، مقصد مشترکہ گھرانے سے فرار ہے۔ یہ فرار کا سفر ہمارے کلچر میں تیزی سے جاری ہے جس سے بوڑھے والدین کرب اور جبر کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اولاد کی دوری کا دکھ جھیلنا اتنا آسان نہیں ہوتا، رشید امجد اس افسانے میں ایسی ہی صورتحال سے آگاہ کرتے ہیں۔

"بیٹے نے لمبی چوڑی بات نہیں کی۔ بولا۔ "ہم تو اگلے ہفتے چلے جائیں گے۔ آپ لوگوں کا جب جی چاہے آجائیں"۔

اس نے بہو کی طرف دیکھا جو مسکین بنی پیچھے کھڑی تھی اور سوچا، "یہ زندگی بھی عجب ہے بیٹیاں پیدا کرو انہیں پالو پوسو اور پھر دوسروں کے حوالے کر دو، بیٹوں کو جوان کرو تو دوسری لڑکیوں کے حوالے کر دو جوان کو لے کر چلتی بنیں۔"(۳۲)

مندرجہ بالا اقتباس میں ہماری روزمرہ زندگی کے حالات پر کڑی تنقید کی گئی ہے جہاں مشکل دونوں طرف والدین کو ہے جو بیٹوں اور بیٹیوں کے جانے کے دکھ میں مبتلا ہیں۔ یہ ہمارے کلچر کا ایسا جبر ہے جو دن

بدن بڑھ رہا ہے۔ جدید زندگی میں سہولتوں کی فراوانی ہے۔ عام آدمی بھی موجودہ دور کی بنیادی سہولتوں سے استفادہ حاصل کر رہا ہے۔ پرانی طرز زندگی کی جگہ نئے طور طریقے آ چکے ہیں۔ شہری و دیہی ہر دو سطح پر تبدیلی آ چکی ہے۔ لباس، خوراک، رہائش سب کچھ جدید سے جدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ روایتی کھانوں کی جگہ فاسٹ فوڈ، مشرقی لباس کی جگہ مغربی لباس اور کھلے مکانات کی جگہ فلیٹ نے لے لی ہے۔ کلچر میں تبدیلی کو فرد مجبوراً قبول کر رہا ہے۔ رشید امجد اپنی کہانی "مسکراتے لمحے سے نکلتی ایک افسردہ کہانی" میں اس بدلاؤ اور پرانی راویات کی شکستگی کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

> "نہ کسی سبزی میں، نہ کسی پھل میں، کسی شے میں ذائقہ نہیں ہے۔ ذائقہ تو اب زندگی میں بھی نہیں۔ ہر شے سپاٹ ہو گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا کپڑے دھونے والے صابن سے نہاتے ہوئے کتنا اچھا لگتا تھا۔ اب جیل تھے، باتھ واش تھے، ماؤتھ واش تھے۔ واش ہی واش، خوشبوؤں سے بھرے لیکن ان خوشبوؤں میں لذت نہیں تھی۔ ان کا ذائقہ نہیں تھا، بس باتھ روم سجا ہوا تھا۔ اسے پرانا پاخانہ، کمرے کے کونے میں بالٹی سے نہانا، پھر پرانا باتھ روم اور اس کی لذت یاد آتی۔ ان کا خیال کر کے ہنسی آتی۔ اپنے آپ سے کہتا، "وہ جو کچھ بھی تھا اس میں ایک مزہ تو تھا" اور اب سب کچھ تھا مگر مزہ ہی نہیں تھا!"۔[۳۳]

اس کہانی میں خوراک اور ذائقے نئی اور پرانی زندگی میں فرق کو واضح کرتے ہیں۔ طرزِ زندگی میں تبدیلی تو آ گئی لیکن اس میں لذت، خوشی اور سکون کی کمی ہے۔ فرد جدید سہولتوں کے باوجود پرانے دور میں خوش اور پُر سکون تھا، لیکن اب نہیں۔ یہ تبدیلی رشید امجد تجرباتی بنیادوں پر محسوس کرتے ہیں۔ وقت اور حالات کا تقاضا ہے کہ فرد سماجی اقدار کے بدلاؤ کو جبراً قبول کر رہا ہے۔ انہوں نے کلچر کے نئے رجحانات کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ فرد کی زندگی پر اثرات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

"دکھ ایک چڑیا ہے" جدید زندگی کا عکاس افسانوی مجموعہ ہے۔ دورِ حاضر میں بھی سماجی رسوم و رواج کو روایتی انداز میں منایا جاتا ہے۔ شادی کی رسوم، مذہبی تہوار اور دیگر رسوم و رواج کی تقاریب کا بہت دل جمی سے اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان مواقع پر گھر و دیگر مہمان شرکت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو وقت دیتے ہیں۔ وہ افراد جو اپنوں سے دور ہیں، ان کی شرکت اب آن لائن ہو گئی ہے۔ سکرین کے آمنے سامنے بیٹھ کر دکھ سکھ

بانٹے جا رہے ہیں۔ ایسے منظر نامے کو رشید امجد "گماں کے رشتے" میں سالگرہ کی تقریب کا یوں ذکر کرتے ہیں:

"بچے کے بڑھنے کا ایک لمحہ ان کے سامنے تھا۔ اس کی پہلی سالگرہ اس طرح منائی گئی کہ سکرین کے سامنے وہ لوگ اور سکرین کے اندر بیٹی، داماد اور نواسہ، کیک کاٹا گیا۔ بیٹی نے بچے سے کہا۔ "وہ دیکھو نانا ابو۔ نانی اماں"۔ (۳۴)

یہ ثقافتی رسومات کا وہ جبر ہے جو فرد کے جذبات و احساسات کو مجروح کرتا ہے۔ بظاہر تو یہ خوشی کے مواقع ہیں لیکن واجبی سے مسکراہٹ کے پیچھے درد ہے۔ دور حاضر میں اپنوں کے جنازے بھی سکرین پر دیکھے جا رہے ہیں۔ جنازے کو کندھا دینے کی اہمیت دم توڑ چکی۔ رشید امجد اس جبری کیفیت سے کشمکش کا شکار ہیں۔ "انسان کی پریشانی کے اسباب تلاش کرنا اور پھر انہیں اپنے مخصوص انداز میں تہذیب و ثقافت کو سامنے رکھتے ہوئے پرکھنا اور نتائج حاصل کرنا رشید امجد کا خاص وصف ہے"۔ (۳۵)

معاش اور روزگار کی لئے شہروں کی آبادی میں آئے روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے کھلے مکانات کی جگہ کئی منزلہ فلیٹوں نے لے لی ہے۔ کشادہ گھروں کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ شہروں میں جگہ خریدنا ہر آدمی کی بساط نہیں۔ چھوٹے مکانات اور فلیٹ کا زمانہ آگیا ہے۔ جس کی وجہ سے محلے داری تعلقات کا فقدان آگیا ہے۔ ثقافتی و تہذیبی اقدار بدل گئی ہیں۔ فرد مجبوراً نئی روایات کو اپنا رہا ہے۔ کیونکہ واپسی کا راستہ یا تو بند ہو چکا ہے، یا کٹھن ہو گیا ہے۔ رشید امجد نئے طرزِ رہائش میں فطری مظاہر کی گمشدگی کی عکاسی کرتے ہوئے "اپنی اپنی بلی" میں لکھتے ہیں

"اپنے شہر میں تو ہر طرف تازگی تھی، کھلی فضا، ہلکا پھلکا ہونے کے لئے کہیں جانا نہیں پڑتا لیکن یہاں کی چکا چوند، ہاؤ ہو اور ہنگاموں میں شاید اس کی ضرورت تھی۔

ساٹھویں منزل کے فلیٹ سے نکل کر پارک میں آیا تو لگا پہلی بار پاؤں زمین سے لگے ہیں۔ لش لش کرتی سبز گھاس، پھولوں کی قطاریں اور مدھم مدھم قدم رکھتی ہوا کا رقص، لمبا سانس لیا۔ لگا سارا وجود سرمئی روشنی اور پھولوں کی مہک سے کھل اٹھا ہے"۔ (۳۶)

اس کہانی میں دو تہذیبوں کا امتزاج دکھایا گیا ہے۔ فرد ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں بوجہ مجبوری جاتا ہے۔ جہاں فلیٹ کی ساٹھ منزلہ عمارت میں رہائش پذیر ہے۔ ایسی طرزِ زندگی کو اپنانا اس کے لئے انتہائی مشکل ہے۔ لیکن مجبوریوں کی زنجیر نے اسے جکڑ رکھا ہے۔ رشید امجد جدید زندگی کے بدلتے منظر نامے کو سامنے لاتے ہیں۔ کھلی فضا اور بڑے گھرانوں کے افراد کے لئے فلیٹ زدہ زندگی سوائے قید کے کچھ نہیں۔ لیکن نئی نسل جو فلیٹوں میں پروان چڑھ رہی ہے وہ خود کو اس ماحول میں ڈھال چکی ہے۔

ب۔ رشید امجد کے افسانوں میں جبر کے نفسیاتی تناظرات

فرد کی زندگی خارج کے ساتھ داخل سے بھی وابستہ ہے۔ داخل کا تعلق انسانی نفسیات سے ہے۔ انسان کے اندر بھی ایک دنیا آباد ہے جس کا کھوج نفسیات دانوں نے لگایا ہے۔ ماہرین نفسیات فرائڈ، ژونگ اور ایڈلر نے انسانی نفسیات کی تہہ داریوں تک پہنچنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ خارج سماجی تناظرات سے منسلک ہے جبکہ داخل جبلی، اعصابی، شعوری اور لاشعوری تناظرات سے وابستہ ہے۔ رشید امجد اپنے ارتقائی سفر میں خارج سے داخل میں پہنچ کر اندر کی دنیا کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں خارج اور داخل کا امتزاج بھی ہے اور تصادم بھی۔

i. جبلت کا جبر

جبلت ایسی طاقت کا نام ہے جو اپنی تسکین کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ جب تک جبلت اپنا کام پورا نہ کر لے تب تک وہ کسی نہ کسی طرح انسانی حواس کو اکسائے رکھتی ہے۔ یہ جبلتیں انسان کی موروثی بھی ہو سکتی ہیں، ماحول کی بدولت بھی اور سماجی حوالے سے بھی۔ جبلتوں کا انسانی رویوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ علم نفسیات نے جبلت کی بہت سی اقسام متعارف کروائی ہیں۔ جن میں جنس، بھوک، پیاس، غصہ قابل ذکر ہیں۔ جنسی جبلت کی اہمیت زیادہ ہے۔ فرد کی پیدائش سے لے کر آخری دم تک جنسی جبلت سرگرم عمل رہتی ہے۔ فرائڈ بنیادی طور پر فلسفہ زندگی میں جبلت کو دو طرح سے تقسیم کرتا ہے۔ ایک جبلت حیات، جس میں انسانی زندگی تعمیری نتائج سے مبرا ہوتی ہے جبکہ دوسری جبلت مرگ، جس میں انسانی زندگی تخریبی (منفی) نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نعیم احمد لکھتے ہیں کہ جبلتوں کا معروض وہ شے ہے جس سے جبلت کا مقصد پورا ہوتا

ہے جیسے بھوک کی جبلت کا معروض کھانا، جنس کا مباشرت، تشدد کا لڑائی جھگڑا۔ حالات وواقعات سے معروض بدلتے رہتے ہیں۔[۳۷]

رشید امجد کی کہانیاں انسانی جبلتوں کی عکاس ہیں جس میں منفی اور مثبت ہر دو طرح کے نتائج ملتے ہیں۔ ان کا افسانہ 'روایت' ایسی ہی ایک جنسی جبلت کی نشاندہی کرتا ہے جو دانستہ ونادانستہ طور پر نسل در نسل منتقل ہو رہی ہے۔ اس افسانے میں دوسری شادی کے ذریعے جنسی جبلت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں باپ نے دوسری شادی کی تو اسے بہت برا لگا تھا کہ وہ اپنے باپ سے الگ ہو گیا ہے اور اس کی شفقت میں کمی آگئی۔ لیکن جب اپنی باری آئی تو اس نے خود کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ میری ماں کا سہارا نہیں تھا جبکہ میری پہلی بیوی خود کماتی ہے اسے کسی قسم کی فکر نہیں ہو گی۔ بعد میں اس کے اپنے بیٹے نے بھی وہی قدم اٹھایا۔ تو یہ رویے دراصل اس جبلی طاقت کو مطمئن کرنے کے لئے تھے جو اسے دوسری شادی پر اکسا رہی تھی۔ ماہرین نفسیات شادی کو جبلی اور طلاق کو عقلی عمل قرار دیتے ہیں۔ فرائڈ کے نزدیک شادی کی روایت جنسی جبلت ہے جس کے پیچھے لیبیڈو کی قوت سرگرم عمل ہے۔

"رات کا کھانا کھا کر جب بچے اپنے کمرے میں چلے گئے اور بیوی بیڈروم میں جانے لگی تو اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں دوسری شادی کر رہا ہوں"۔

بیوی ذہنی طور پر، شاید، بہت دنوں سے اس جملے کا انتظار کر رہی تھی۔

اس نے سرد لہجے میں کہا۔۔ "یہ تو تمہاری خاندانی روائت ہے، تمھارے باپ نے بھی یہی کیا تھا"[۳۸]

جب اس کا بیٹا یہ قدم اٹھاتا ہے تو اس کا رویہ پھر وہی ہو جاتا ہے جو اس کا اپنے باپ کے ساتھ تھا، کیونکہ اس کی پہلی بہو بہت ہی وفا شعار اور سلیقہ مند تھی لیکن اس کا بیٹا یہ سب بالائے طاق رکھتے ہوئے دوسری شادی کر لیتا ہے اور کہتا ہے۔

"بیٹا اب سنبھل گیا تھا، ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔۔۔ "اس میں عجیب بات کیا، آپ نے بھی تو دوسری شادی کی ہے اور دادا ابو۔۔۔ "وہ کرسی پر ایسے ڈھیر ہوا جیسے دیوار بیٹھ جاتی ہے"۔[۳۹]

یہ جبلت فرد کے گھریلو ماحول اور وراثت دونوں میں پائی گئی ہے اور اس جبلی تسکین کو بھی پورا کیا گیا یہ سوچے بغیر کے سابقہ بیوی بچوں کا کیا ہو گا، یا وہ کیا سوچیں گے۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش لکھتے ہیں:

"ترقی پسند اثرات کے علاوہ، جدید اردو افسانے میں فرائڈ اور ژونگ کے نظریات کے باعث فرد کے اندر کی نفسیاتی کشمکش کو موضوع بنانے کا چلن عام ہوا۔ تاہم یہ محض بیرونی اثرات کا نتیجہ نہیں تھا۔ یوں بھی معاشرہ زمین کے ساتھ جڑا رہے تو وہ نفسیاتی طور پر جڑا ہوتا ہے"۔ (۴۰)

جبلی طاقت انسان کو مختلف طریقوں سے اپنے حصار میں لینے کی بھرپور کوشش کرتی ہے۔ فرائڈ جبلت کے پیچھے لیبیڈو کی طاقت کو کار فرما سمجھتا ہے۔ کہ فرد میں جنس کی طاقت اسے ہر کام کرنے پر اکساتی ہے۔ لیبیڈو کی طاقت کے سامنے انسان مجبور محض ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی لکھتے ہیں کہ حیاتیاتی تقاضے جبلتوں کے تابع ہوتے ہیں، فرد ان تقاضوں کو روکنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کسی نہ کسی طرح پورے ہو ہی جاتے ہیں (۴۱)۔ رشید امجد نے 'ڈائری کا نیا صفحہ' میں ایسی ہی جبلت کی نشاندہی کی ہے جس میں انسان ناجائز تعلقات کی حد تک چلا جاتا ہے۔ جنس پرستی کی جبلت ہے جو اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

" سر یہ لیٹر دیکھ لیں، اس نے آگے بڑھ کر کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا" رکھتے ہوئے اتنی جھکی کہ اس کی نظریں اس کے ابھرتے سینے میں سے ہوتی ہوئی شاید اس کی ناف تک اتر گئیں۔ پورے جسم میں برقی لہریں دوڑ اٹھیں۔ کئی برسوں بعد۔۔۔ بیوی کی وفات کے بعد اس نے کسی عورت کو اپنے قریب محسوس نہیں کیا تھا"۔ (۴۲)

روز مرہ زندگی میں لاشعور کا عمل دخل زیادہ ہے۔ فرد سماجی مجبوریوں کے باعث اپنی خواہشات کو دبا کے رکھتا ہے۔ ایک عرصہ تک خواہشات کی عدم تکمیل فرد کے لئے دباؤ کا باعث بنتی ہے۔ فرد ایگو اور سپر ایگو کی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ فرد سماجی اقدار کو پس پشت ڈال کر جنسی جبلت کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ ہمارے سماج میں جنس پرستی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ماہرین نفسیات اس کو سوسائٹی کی قیود کا ردعمل قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئے روز سماج میں ریپ اور مبینہ زیادتی کے کیس سامنے آرہے ہیں۔

"فلیٹ شاندار تھا، وہ لاونج میں صوفہ پر بیٹھنے لگا تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ روم میں لے آئی۔ مدتوں سے پیاسے بنجر کھیت کی مٹی کے کھلے منہ لبالب بھر گئے۔ بادل ایسا برسا کہ تراوٹ نیچے تہہ میں اتر گئی"۔ (۴۳)

جنسی جبلت فرد کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ فرائیڈ کے نزدیک بچپن میں بچوں کا انگوٹھا چوسنا بھی جنسی تسکین کی مثال ہے۔ لڑکپن میں جنسی تسکین اعضائے مخصوصہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ سے پوری کی جاتی ہے۔ پختہ عمر میں جنسی ملاپ اس جبلت کو پورا کرتا ہے۔ رشید امجد معاشرے کی اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ جنسی تعلقات انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ فرد نفسیاتی طور پر اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جائز و ناجائز تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ جس میں سوسائٹی کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔ اسلامی طرز زندگی میں اسی لئے دوسری شادی کی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ معاشرتی بگاڑ کم سے کم پیدا ہو۔

ii. شعور کا جبر

فرائیڈ انسانی شخصیت کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ شعور، تحت الشعور اور لاشعور۔ نفسیاتی عمل ان تین سطحوں پر حرکت پذیر ہوتا ہے۔ شعور انسان کی حاضر یادداشتیں ہیں، تحت الشعور درمیانی حصہ ہے جو شعور اور لاشعور کی درمیان پُل ہے۔ جسے یاداشتوں کی عارضی آماجگاہ کہا جاتا ہے۔ لاشعور انسانی شخصیت کا وہ حصہ ہے جہاں پیدائش سے لے کر موجودہ وقت تک واقعات، خواہشات جمع ہوتی آرہی ہیں۔ لہذا انسان اپنی زندگی میں جو کچھ کر رہا ہوتا ہے اور جو اس کے ساتھ ہوتا ہے وہ اس کے لاشعور کا حصہ بنتا رہتا ہے۔ لیکن بات یہاں نہیں رکتی، لاشعوری حافظہ کا کچھ حصہ جب شعور کی سطح پر آتا ہے تو انسان میں کافی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ رشید امجد کی کہانیوں کے کردار ایسی شخصیت کے عکاس ہیں جہاں لاشعور سے شعور کی سطح پر ہلچل ہوتی رہتی ہے۔ جس سے کرداروں کی زندگی میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ ایسی صورتحال میں انسان شعوری طور پر جبر کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انسان کا دماغ شعوری طور پر نئی جہات کے راستے نکالتا ہے جو انسانی شخصیت کو بکھیر دیتا ہے۔ انسان ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کے دائرے میں گھومتا رہتا ہے۔ شعوری سطح پر کارفرما محرکات انسان کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں۔ رشید امجد کا افسانہ 'خبطی' بھی ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو اپنے آپ کو شعوری طور پر ایک دائرے میں گم کر دیتا ہے۔ یہ دائرہ اس کے ماضی سے مختلف

ہے۔ اس کے لاشعور میں کچھ اور تھا لیکن شعور میں کچھ اور ہے۔ یہ کشمکش اس کی نفسیات پر گہرے اثرات پر تب کرتی ہے۔

" بچپن ہی سے اچھا بننے کا شوق تھا۔ اس شوق کے ہاتھوں زندگی بھر خوار ہوا۔ بچپن میں جب دوسرے بچے کسی کام سے انکار یا ٹال مٹول کرتے تو وہ آگے بڑھ کر اسے اپنے ذمے لے لیتا۔ "(۴۴)

یہ افسانہ شعوری طور پر فرد کو حالات سے نبرد آزما ہوتے دکھائی دیتا ہے۔ جب کھرے اور کھوٹے کا فرق روانہ رکھا جائے تو فرد کا ضمیر ملامت کرتا ہے۔ خارج اور داخل کا تصادم زندگی کے نئے زاویوں سے روشناس کراتا ہے۔ سماجی رویوں نے فرد کی زندگی بکھیر دی ہے۔

" عمر کے درمیانے حصے میں پہنچ کر اب یہ شوق شوق نہیں رہا تھا تکلیف دہ صورت پیدا کرنے لگا تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب کوئی صلہ ملتے وقت اس میں اور دوسروں میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا۔

" گدھا گھوڑا سب برابر ہیں " اسے کئی بار خیال آتا۔۔۔ "۔(۴۵)

انسان اپنے شعور کے ہاتھوں مجبور ہے۔ ایک اچھا انسان ہمیشہ خود کو مثبت راستے پر چلنے کی ترغیب دیتا ہے، اس کا ضمیر اسے غلط کام سے روکنے پر مجبور کرتا ہے، چاہے اسے نقصان بھی کیوں نا ہو۔ فائدہ ،نقصان کی پرواہ کئے بغیر شعوری طور پر وہ اچھے اعمال کو ترجیح دے گا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ شعوری طور پر اچھے اور برے کی پہچان کر سکتا ہے۔ شعور ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ رشید امجد کا افسانہ 'انتظار' شعوری جبر کی عمدہ مثال ہے، اس افسانے میں کردار خود کو انتظار میں رکھتا ہے۔ اس کا شعور ایک انتظار کے بعد اگلے انتظار میں مبتلا نظر آتا ہے۔ زندگی کا پہیہ رواں دواں ہے لیکن انتظار ہے۔ یہ شعوری سطح پر مستقبل کی کھوج اس افسانے کا مرکزی نقطہ نگاہ ہے۔

" اب مجھے کس کا انتظار ہے ؟ "۔۔۔ جنجھلا جاتا۔۔۔ " زندگی گزار لی بہت اچھے طریقے سے "۔(۴۶)

مصنف اس افسانے میں بچپن سے بڑھاپے کا سفر کراتے ہیں، بچپن سکول، ملازمت، محبت، شادی، بچے والدین کی وفات، ریٹائرمنٹ۔ ایک کے بعد دوسرے کا انتظار ختم ہوتا ہوتا بڑھاپے تک آگیا۔ زندگی کو درجہ بدرجہ اچھے طریقے سے گزار لیا۔ لیکن شعور اسے انتظار میں مبتلا رکھتا کہ اب مزید کیا ہو گا۔

" خبروں میں اسے وہ خبر تو نہ ملی جس کا اسے انتظار ھا لیکن ایک دن وہ خود خبر بن گیا۔ تعزیت کے لئے آنے والے کہہ رہے تھے "مطمئن شخص تھا اچھی زندگی گزار گیا"۔ (۴۷)

رشید امجد شعور کی ہیجانی کیفیت کو اجاگر کرتے ہیں جہاں انسان بے بس ہے اور سب کچھ ہو کر بھی کچھ کمی کا احساس رہتا ہے۔ یہ ایسا جبر ہے جو شعور کو سکون نہیں بخشتا۔ انسان تذبذب کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔ شعور انسان کی ہوش و حواس کی متحرک کیفیت کا نام ہے لہذا رشید امجد اپنے کردار کو نیند یا خواب میں انتظار نہیں کرواتے بلکہ وہ عالم جاگ میں انتظار کرتا چلا جاتا ہے۔

iii. لاشعور کا جبر

لاشعور انسانی دماغ کا وہ حصہ ہے جہاں واقعات جمع ہوتے رہتے ہیں۔ اور ایک ایسی طاقت بنتے ہیں جو انسانی اعصاب کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ فرائڈ نے لاشعوری محرکات کے مشاہدات کئے جس سے یہ اخذ کیا کہ انسانی خواہشات کے پیچھے لاشعوری طاقت کام کرتی ہے۔ انسان خود بخود ایسے کام کرتا جاتا ہے جس کا اسے ادارک نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب "ادب اور لاشعور" میں لکھتے ہیں:

" افسانے میں لاشعوری محرکات کا تجزیہ دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ سماجی سطح پر فرد کا فرد اور فرد کا معاشرے سے تعلق ہوتا ہے یوں باہمی اثر پذیری اور عمل و رد عمل کی بنا پر مختلف حالات اور وقوعات سائیکی کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے رہتے ہیں اور فرد اپنے حقیقی "روپ" میں سامنے آجاتا ہے۔۔۔ دوسرا طریقہ محض فرد کی ذات و وجود تک محدود ہے، افسانہ نگار ذہنی الجھنوں، نفسی کج رویوں اور پھر ان سے جنم لینے والی کرداری پیچیدگیوں اور ان سے وابستہ علامات پر سے پردہ اٹھاتا ہے"۔ (۴۸)

رشید امجد انسانی نفسیات کے نباض ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کرداروں میں لاشعوری کارفرمائی اکثر نظر آتی ہے۔ اسی لاشعوری طاقت کے سامنے بے بسی 'گل ہی نہ جانے 'میں دکھائی گئی ہے جہاں غیر ارادی قوت کے سامنے بے بسی کے علاوہ کچھ نہیں۔

> "اس نے خود پر بڑا جبر کیا۔بیوی بچوں کے سامنے چور سا بنا پھرا، کسی کو شک بھی نہیں ہوا لیکن لگتا تھا وہ سب جانتے ہیں۔ سوچا کچھ بھی ہو جائے اب ادھر نہیں جائے گا، اپنی جگہ اپنے نائب کو بھیج دے گا لیکن ہفتہ بھر بعد ہی وہاں کی میٹنگ کا ایجنڈا آیا تو اس نے، جیسے کوئی زبردستی سب کچھ کرا رہا ہو"۔ [۴۹]

فرد کی ہیجانی کیفیت اس کی لاشعوری محرکات کو اجاگر کرتی ہے۔ مصنف نے انسانی زندگی کو مختلف زاویوں سے نہ صرف دیکھا بلکہ پر کھا ہے۔ سماجی بے حسی، کج روی اور عدم استحکام نے انسانی لاشعور پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ جو رشید امجد کے کرداروں پر بادلوں کی طرح چھائے نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> "زندگی کے عام افراد کی مانند افسانے کے کرداروں کے مطالعے میں نفسیاتی محرکات کی اہمیت سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ فرد دو طرح سے زیست کرتا ہے، ایک شعوری (سماجی) سطح پر دوسری لاشعوری طور پر، اس لئے فرد کی شخصیت ان دو قوی مقناطیسوں کے درمیان ناتواں سوئی کی مانند لرزاں رہتی ہے۔" [۵۰]

فرد کے اپنے اوپر کسی خیال کو حاوی کر لینے کے پیچھے لاشعوری محرکات عمل پیرا ہوتے ہیں۔ کسی چیز کے کھو جانے کا غم کو فرد تحلیل نہیں کر پاتا تو جبر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ لاشعور جبرًا اس چیز کا مطالبہ کرتا ہے جو اب اس کی بساط میں نہیں ہوتا، پھر پچھتاوے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ "طوطے کی موت" ایسی جبری کیفیت کو سامنے لاتی ہیں جہاں فرد اپنے کئے پر پچھتاتا ہے اور واپسی کے دروازے بند ہو چکے ہوتے ہیں۔ لاشعور دن رات، سوتے جاگتے اسے اس طوطے کو یاد کرتا ہے جسے گھر بھول آیا تھا اور اب اس طوطے کے پاس چند دن کے کھانے کے علاوہ کچھ نہیں۔ طوطے کی قید اسے اندر سے بکھیر دیتی ہے۔ رشید امجد طوطے کو بطور علامت پیش کرتے ہیں۔ یہ علامت فرد کی لاشعوری محرکات کی عکاس ہے۔ جہاں انسان کی بے بسی اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔ زندگی بوجھ بن جاتی ہے۔

"تو طوطے کا کیا ہوا؟" پوتی نے پوچھا۔

"طوطا بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر گیا۔" اس کے لہجہ اور آواز کے کرب نے بیوی کو چونکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ صوفے پر ساکت ہو گیا تھا۔ تیزی سے لپک کر وہ اس کے پاس آئی۔ ماں کی چیخ سن کر بہو اور بیٹا بھاگے آئے"۔ (۵۱)

'طوطے کی موت' رشید امجد کے لاشعوری تناظرات کی عمدہ مثال ہے۔ اس کہانی کا کردار خارج سے داخل کی طرف سفر کرتا ہے۔ اپنے گھر سے لگاؤ اس حد تک ہے کہ اس کو چھوڑنے کا مطلب اس کی موت ہے۔ یہ بات اس کے لاشعور پر ہر وقت ٹمٹماتی رہتی ہے کہ اس گھر سے نکلنا اس زندگی سے جانا ہے۔ رشید امجد اکثر طوطے اور پنجرے کی علامتیں استعمال کرتے ہیں۔ زندگی اور اس کا مخصوص دائرہ اس کردار کا زماں و مکاں ہے۔ 'اضطراب شام تنہائی' میں رشید امجد لاشعوری محرکات بیان کرتے ہیں۔ ذہنی خلل کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر نفسیات کہتے ہیں کی اضطرابی کیفیات کے پیچھے کوئی نہ کوئی واقعہ ہوتا ہے۔ جس کے اثرات لاشعور پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ فرد جو کرنا چاہتا ہے وہ نہیں کر پاتا۔ لیکن اس کا ادراک اسے الٹ کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ یہی داخلی کشمکش اس کہانی کا منبع ہے۔

"پچھلے کئی دنوں سے لگ رہا تھا کہا اس کے جسم کے اعضاء اس کی منشا کے تحت نہیں بلکہ اپنے اپنے طور پر کام کر رہے ہیں۔ کہیں جانا ہوتا تو پاؤں دوسری طرف چل پڑتے۔ کوئی چیز اٹھانی ہوتی تو ہاتھ کسی دوسری چیز کو اٹھا لیتا۔ جو دیکھنا چاہتا، آنکھیں کچھ اور منظروں کی طرف لے جاتیں"۔ (۵۲)

حالات و واقعات فرد کے خارج اور داخل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ الجھن، ذہنی تناؤ اور تشویش بڑھ جاتی ہے۔ اکثر ایسے ہوتا ہے کہ کوئی چیز ہمارے ہاتھ میں ہوتے ہوئے بھی ہم ادھر اُدھر ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں مثلاً کہیں جانے کی جلدی، دیر ہونے کا خوف وغیرہ۔ رشید امجد ایسی صورتحال کو عمدگی سے بیان کرتے ہیں۔ معاشرتی نفسا نفسی فرد کی داخلیت کو قابو کر چکی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عائشہ بیگم، تاریخ اور سماجیات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۰۹ء، ص ۲۵

۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی باتیں، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۲ء، ص ۷۵

۳۔ رشید امجد، دکھ ایک چڑیا ہے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۶۸، ۶۹

۴۔ ایضاً، ص ۶۹

۵۔ ایضاً، ۴۸

۶۔ ایضاً، ص ۴۹

۷۔ ایضاً، ص ۸۸

۸۔ ایضاً، ص ۸۹

۹۔ ایضاً، ص ۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۲۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۲۱

۱۴۔ ایضاً ص ۴۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۶۔ وِل ڈیورانٹ، نشاطِ فلسفہ، مترجمہ ڈاکٹر محمد اجمل، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۹ء، س ۹۷

۱۷۔ رشید امجد، دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۳۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۱۹۔ صفیہ عباد، ڈاکٹر، رشید امجد کا نیا افسانوی مجموعہ "دکھ ایک چڑیا ہے" کا مطالعہ و تجزیہ" (مضمون) مطبوعہ: الماس، شمارہ ۲۰، ۲۰۱۸ء، جامعہ عبد الطیف بھٹائی، خیر پور، ص ۱۰۰

۲۰۔ رشید امجد، دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۳۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۴۳

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۰

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۰

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۱

۲۹۔ مبارک علی ڈاکٹر، تاریخ کی شکستگی، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۷۶

۳۰۔ رشید امجد، دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۹۲

۳۱۔ ایضاً، ص ۹۲

۳۲۔ ایضاً، ص ۹۳

۳۳۔ ایضاً، ص ۶۴

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۳۵۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر / محمد یوسف، رشید امجد کے افسانوں میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا اظہار، (مضمون) مطبوعہ: تحقیقی جریدہ، شمارہ ۷، ۲۰۲۰ء (جنوری-جون)، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ ، ص ۱۷۹

۳۶۔ رشید امجد، دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۲۴۴

۳۷۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، فرائڈ- نظریہ تحلیل نفسی، نگارشات، لاہور ۲۰۱۹ء، ص ۴۷

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۴۰۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۵۶۳

۴۱۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، اردو افسانہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۹۰

۴۲۔ رشید امجد، دکھ ایک چڑیا ہے، ص، ۱۷۶

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۷۸

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۹۳

۴۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور لاشعور، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۵

۴۹۔ رشید امجد، دکھ ایک چڑیا ہے، ص،۲۳۰

۵۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور لاشعور، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۱۹۱

۵۱۔ رشید امجد، دکھ ایک چڑیا ہے، ص،۲۱۲

۵۲۔ ایضاً، ص۵۶



باب سوم

رشید امجد کے افسانوں میں خوف کے عناصر: تجزیاتی مطالعہ

خوف ایسی کیفیت ہے جو فرد میں بے یقینی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کوئی بھی عمل جس کے نتیجے میں ذرا سی بھی دیر ہو خوف کا باعث بنتا ہے۔ خوف اُن حالات و واقعات کے باعث پیدا ہوتا ہے، جن کا تعلق فرد کی خارجی اور داخلی دنیا سے ہے۔ خارج اور داخل ایک دوسرے کا ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔ انسان چونکہ معاشرتی حیوان ہے جس کی بدولت ہر شعبہ ہائے زندگی میں سماج سے منسلک ہے۔ سماجی اداروں میں عدم استحکام کی بدولت فرد میں بے یقینی جنم لیتی ہے۔ جس سے انجانا خوف انسان کے اندر گھر کر جاتا ہے۔ خوف کسی ایک حالت میں وارد نہیں ہوتا، اس کی حالتیں سماجی ماحول کی بدولت بدلتی رہتی ہیں۔ یہ دائمی بھی ہو سکتا ہے اور عارضی بھی، انفرادی بھی ہو سکتا ہے اور اجتماعی بھی۔

اردو ادب میں ادباء نے اپنے اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہوئے جبر و خوف پر بہت کچھ لکھا۔ جدید افسانہ نگاروں کی ایک بڑی جماعت نے خوف کو بہ طور خاص موضوع بنایا۔ اس جماعت میں ایک نام رشید امجد کا ہے۔ جس نے ساٹھ کی دہائی میں لکھت کا آغاز کیا۔ رشید امجد نے گزشتہ چھ دہائیوں میں آمریتی دور، سیاسی عدم استحکام اور جمہوری نظام کی مفلوجی کو نہ صرف دیکھا بلکہ پرکھا اور اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا۔ ایسے ادوار میں فرد کی بے بس، جبرًا اور بکھرتی زندگی کی وجہ سے پیدا ہونے والے خوف کو اجاگر کیا گیا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> "رشید امجد کا فن احساس کی ان سطحوں کو چھونے کی جانب سرگرم ہے۔ جو آسانی سے
> دسترس میں نہیں آتیں۔ وہ ان مسلوں اور الجھنوں کے بارے میں سوال اٹھاتے ہیں۔
> جنہیں آج کے انسان نے نئے عہد کا موڑ مڑتے ہی اچانک سامنے پایا ہے"۔ (۱)

رشید امجد اپنے عہد کے نباض افسانہ نگار ہیں۔ ان کی نگاہ قومی حدود کو پھلانگتی ہوئی بین الاقوامی سرحدوں سے جاٹکراتی ہے۔ جہاں فرد خوف کی زندگی میں مبتلا ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'دکھ ایک چڑیا ہے'، جدید زندگی کا عکاس ہے۔ جدید زندگی میں فرد جس کرب، جبر اور درد میں مبتلا ہے، ان کی کہانیوں کے خاص موضوعات ہیں۔ رشید امجد گھر کے ایک کمرے سے اپنی پرواز شروع کرتے کرتے مابعد الطبعیات کے دائرے میں جاپہنچتے ہے اس پورے سفر میں فرد کی خوفزدہ راہیں سامنے آتی ہیں۔ رشید امجد انفرادی و اجتماعی ہر دو سطحوں پر خائف زدہ زندگی کو پرت در پرت کھولتے ہیں۔ سماج میں خاندانی نظام کی ڈولتی کشتی پر رشتوں میں دوریوں کا خوف، بڑھاپے میں گرتی لاٹھی کا خوف، قبر میں اندھیرے کا خوف، مشینی افراتفری کا خوف، خیر وشر کا خوف، ریاستی و سامراجی دہشت، طاقت کا خوف، کمزور کو طاقت ور کا خوف، طاقت ور کو مستحکم رہنے کا خوف، غریب کو بھوکا مرنے کا خوف، امیر کو دولت چھننے کا خوف، ذات اور لاذات کا خوف، عشق میں ناکامی کا خوف، زندگی اور موت کی بے بسی کا خوف، خواہشات کی عدم تکمیل کا خوف، پروٹوکول کا خوف، خوابوں کی تعبیر کا خوف، مزاہمت کا خوف، میاں بیوی میں عدم اعتماد کا خوف، گزرے زمانے کا خوف، حال پر کھڑے مستقبل کا خوف، یہ سب رشید امجد کے افسانوں میں عیاں ہوتا ہے۔ رشید امجد لکھتے ہیں:

> "۔۔۔خوف باطنی ہو یا ظاہری، معاشرے کی عام عادات، اعمال اور اشخاص کے ذاتی و اجتماعی رویوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ خوف کی ظاہری یا باطنی صورت انفرادی و اجتماعی نفسیات کو متاثر کرتی ہے اور شعوری یا لاشعوری طور پر ایک خوفزدہ معاشرے کے تہذیبی رویے، حرکات اور سوچ کے انداز بعض ایسے زاویے پیش کرتے ہیں جن کے نفسیاتی تجزیے سے قوم کے اندر لگی خوف و تشدد کی دیمک کی وجوہات تلاش کی جاسکتی ہیں"۔ (۲)

انہوں نے خاص اسلوب علامت، تجرید، تمثیل، پیکر تراشی کے ذریعے خائف اور خوف دونوں کو اپنی کہانیوں میں اجاگر کیا۔ جدید زندگی اور اس سے وابستہ ہر رنگ کو رشید امجد نے خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں اتنے ڈوب جاتے ہیں کہ واپسی کی راہیں گم کر بیٹھتے ہیں اور اچانک جست لگا کر ساحل پر آبیٹھتے ہیں۔ قاری کو اپنے جال میں ایسا قید کرتے ہیں کہ کہانی کہانی کار کے قلم سے نکل کر قاری کے شعور ولاشعور میں ہچکولے کھاتی ہے۔ ہر فرد کسی نہ کسی خوف میں مبتلا ہے۔ زیر نظر افسانوی

مجموعے میں رشید امجد کی کہانیوں کے عنوانات سماجی ونفسیاتی خوف کی بہ طور خاص نشاندہی کرتے ہیں جن میں لذت کا خوف، طوطے کی موت، قیدی، ماتم بال و پر کا اور کچھوے کی موت وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن کے عنوانات جبر اور خوف کے عکاس ہیں۔

الف۔ رشید امجد کے افسانوں میں خوف کے سماجی تناظرات

ہر ادیب اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے۔ سماجی نظام کی بہتری میں ادب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ رشید امجد اپنے افسانوی مجموعے "دکھ ایک چڑیا ہے" میں جدید دور کے سماجی حالات کو قلمبند کرتے ہیں۔ فرد خارجی و داخلی عوامل کی وجہ سے مسائل میں دوچار ہے۔ ان مسائل میں ایک بنیادی مسئلہ 'خوف' ہے۔ رشید امجد کی کہانیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے 'خوف' کی کیفیات کو سماجی حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ ان کہانیوں کی رو سے سماج میں انفرادی و اجتماعی سطح پر خوف کے تناظرات کیا ہیں اور ان سے فرد کی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کی بہ طور خاص نشاندہی کی گئی ہے۔ ان تناظرات کو جزوی طور پر تقسیم کیا گیا ہے۔

i. معاشرتی خوف

معاشرتی عوامل انسان پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسان جہاں رہتا ہے اس معاشرے کا حصہ بن جاتا ہے۔ معاشرتی حدود و قیود کا پابند ہو جاتا ہے۔ گھر، خاندان، ملازمت، حلقہ احباب سب سے جڑ جاتا ہے۔ لہذا معاشرتی نظام میں فرد ایسی زندگی کا خواہاں ہوتا ہے جہاں اس کی عزت ہو۔ اور ایسی کوئی حرکت نہ کرے جس سے معاشرے میں بدنامی کا باعث بنے۔ اگر اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جو معاشرتی اقدار کے خلاف ہو، ذلالت کا خوف لاحق ہو جاتا ہے۔ رشید امجد ایسے ہی خوف کو اپنے افسانے 'صحرا کہیں جسے' میں بیان کرتے ہیں۔ اس افسانے میں ان سماجی نظروں کی نشاندہی کی گئی ہے جو دوسروں کی تاک میں لگی رہتی ہیں۔ دوسروں کی زندگی میں مداخلت منفی رویہ ہے۔ ہمارے سماج میں ہر تعلق کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ صحرا ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں دور دور تک زندگی کی رونق نظر نہیں آتی، رشید امجد اس صورتحال کو کہانی کے عنوان میں بھی دکھاتے نظر آتے ہیں۔ اس صورتحال کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

"سر! یہ آپ لان میں جو روزانہ مینا کے ساتھ ٹہلتے ہیں، یہ بہت سی نظروں میں ہے، سر!

میں۔۔۔ اصل میں، میں آپ کا بہت احترام کرتی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ آپ اس طرح کے آدمی نہیں۔۔ تو پھر۔۔۔ سر! ذرا محتاط رہیں۔"

اس کے پورے وجود میں میں ایک ٹھنڈی یخ لہر سر سے پاؤں تک دوڑ گئی۔ وہ جواباً کچھ نہیں بولا، سر جھکا کر سامنے رکھی فائل پڑھنے کی بے معنی کوشش کرتا رہا۔"(۳)

یہ افسانہ ہمارے معاشرتی رویوں کا عکاس ہے، جس میں تشکیک کا عنصر غالب ہے۔ فرد کی عمر، رتبہ، پیشہ ایک لمحے میں دھول کی طرح اڑ جاتا ہے۔ لوگوں میں زندہ رہنا اتنا آسان نہیں، یہ خوف انسان کے ساتھ ہر وقت موجود ہے کہ وہ کسی لڑکی کے ساتھ اکیلے میں بیٹھ نہیں سکتا۔ معاشرے کی نظر اسے اپنی نظر میں گرانے پر تلی ہوتی ہے۔ یہ المیہ ہے کہ انسان آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں۔ فرد کو قدم قدم پھونک کر رکھنے پڑتے ہیں۔ دائیں بائیں دیکھ کر چلنا ہوتا ہے۔ لوگوں کی نظروں میں آنے کا خوف ہوتا ہے۔ جس سے کنارہ کشی ممکن نہیں۔ فرد پوری عمر جس مقام کو بنانے میں لگا دیتا ہے اس کے ختم ہونے کا خوف کبھی کم نہیں ہوتا۔

" شام کو وہ چوروں کی طرح کیفے میں آیا، وہ پہلے سے موجود تھی، اسے دیکھ کر مہک اٹھی، "مجھے یقین نہیں تھا آپ آئیں گے۔ "وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔"(۴)

رشید امجد 'صحرا کہیں جسے' میں ایسی صورتحال کو بیان کرتے ہیں جس کے نتیجے سے وہ خائف ہے۔ ایک جوان لڑکی جب عمر رسیدہ شخص سے محبت کا اظہار کرے گی تو سب سے پہلے معاشرے میں عمر کی تفریق کا خوف آڑے ہاتھ لے گا۔ مرد محبت کا صلہ محبت میں دینے کا خواہاں ہے لیکن معاشرے میں بتنگڑ بننے کا خوف، لوگوں کے سوالات جوابات کا خوف، خاندان میں رسوا ہونے کا خوف، جوان اولاد سے نظریں ملانے کا خوف ایسا کرنے نہیں دیتا۔

ہر معاشرے کی اپنی حدود و قیود ہوتی ہیں، ان کا تعین بھی انسان کرتا ہے۔ فرد کے لئے ان حدود کو عبور کرنا ممکن نہیں۔ حدود سے تجاوز فرد کے لئے سزا کا باعث بنتا ہے۔ معاشرتی روایات نے فرد کو اپنی گرفت میں کیا ہوا ہے جہاں سے فرار کا نتیجہ سزا ہے، سخت سزا، جان سے جانے کی سزا، موت کی سزا۔ رشید امجد اس سزا کے خوف کو اپنے افسانے 'عشق کا موسم' میں بیان کرتے ہیں۔ جہاں ایک جوڑا فرار تو حاصل کر

چکا ہے لیکن خوف سے فرار ناممکن ہے۔ خوف انسان کو موت کی طرف دھکیلتا ہے۔ یہ افسانہ سماجی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت ہے جہاں انسان آدم خوروں کی بھیڑ میں زندہ ہیں۔ ہر طرف لالیں ٹپک رہی ہیں۔

"معلوم نہیں یہ میری خود غرضی تھی یا قسمت کا لکھا، میں ایک نئی دنیا میں آگیا، اور وہ۔ انہوں نے اسے کتوں سے نچوا دیا ہو گا، اب بھی اس کی چیخیں میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔"(۵)

غیرت کے نام پر قتل آج بھی ہمارے سماج میں ہوتے ہیں۔ جرگوں کے فیصلوں میں سزائیں سنائی جاتی ہیں۔ معاشرتی نظام سے بغاوت جرم تصور کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو عبرتناک سزاؤں کا خوف ہر سانس کے ساتھ اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔ رشید امجد سماج کے ایسے ظلم و بربریت کو موضوع بناتے ہیں۔

" دروازے تو کئی تھے، ایک گھر کا دروازہ تھا جس سے کئی بار گزرنا ہوتا، ایک دفتر کا دروازہ تھا جس میں صبح جا کر شام کو واپس آنا ہوتا، اور بھی کئی دروازے تھے لیکن ان سب سے دور بہت دور سرمئی دھند میں لپٹا ایک الگ ہی دروازہ تھا جس کے بارے مرشد نے بتایا تھا کہ اس میں داخل تو ہوا جا سکتا ہے لیکن باہر نہیں نکلا جا سکتا، اسے اس دروازے میں داخل ہونے کا تجسس تھا لیکن خوف بھی کہ اگر ایک بار اندر چلا گیا تو واپسی ممکن نہ ہو گی"۔(۶)

'خواب کے پیچھے پیچھے' میں فرد اضطراب کا شکار ہے۔ یہ معاشرتی عدم توازن کی کہانی ہے۔ حال سے مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ ایک تذبذب کی کیفیت ہے جس میں انسان آرام باش نہیں، فرد خود سے نبرد آزما ہے کہ ماضی، حال میں جو ہو چکا سو ہو چکا لیکن مستقبل میں اسے دہرایا نہیں جائے۔ رشید امجد انسانی ذہن کی کشمکش بیان کرتے ہیں جہاں خیر و شر کا مسئلہ ہے۔ حال بدحال ہے، اصلاح درکار ہے لیکن ایسا ہو نہیں پا رہا۔ مرشد امید کی کرن ثابت ہوتے ہیں اور تسلی دیتے ہیں۔ انسان پر ایک وقت آتا ہے جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن وہ معاشرے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اصلاح چاہتے ہوئے بھی نہیں ہوتی۔ اس کہانی کا عنوان ایک ایسے منظرنامے کا عکاس ہے جہاں خواب کی سی صورتحال ہے۔

"اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگتی۔"میرا ظرف کیا ہے" سارا دن میز کی درازیں بھرتے جانا اور چھٹی کے وقت حساب کر کے اپنے افسر کو اس کا حصہ دینا اور۔"

وہ جھنجلا جاتا۔"کام تو میں یہ کرتا ہوں اور تمنا ہے سرمئی دروازے سے اندر جانے کی"

مرشد تسلی دیتا۔"چلو تمنا تو ہے نا، دوسروں میں تو یہ بھی نہیں"۔[۷]

رشید امجد ٹوٹتے انسان کو جوڑنے کا فن جانتے ہیں۔ فرد کی بکھرتی اور کلبلاتی زندگی کو سکون کی تلاش میں نئی راہیں دکھاتے ہیں۔ فرد اپنے کیے پر خائف ہے۔ اس خوف نے انسان کے مستقبل کو سوالیہ بنا دیا ہے۔ وہ معلوم اور نامعلوم کی رسی پر ڈول رہا ہے۔ آج اور کل کا درمیانہ سفر کٹھن ہے۔ بے یقین سمتیں انسان کو اضطراب میں مبتلا کرتی ہیں جس سے کئی وسوسے جنم لیتے ہیں۔ ہمارے سماج میں مادیت پرستی عروج پر ہے۔ جس کے نتائج بھیانک نکل رہے ہیں۔ حرام کی کمائی سے مال و دولت تو ہاتھ آ گئی لیکن سکون غائب ہو گیا۔ اس عدم سکون نے انسان کو جھنجھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔

"لذت کا خوف" معاشرتی رویوں کا نمائندہ افسانہ ہے۔ اس کے عنوان سے بھی خوف کا عنصر واضح ہوتا ہے۔ اس کہانی میں مرد و عورت کے قرب کو گھر کے اندر اور گھر سے باہر دونوں صورتوں میں دکھایا گیا ہے۔ یہ المیہ بھی ہے اور کڑوا سچ بھی جو سماجی سطح پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ فرد کی روشن خیالی کا معاشرتی اقدار کے ساتھ ٹکراؤ، اور اس ٹکراؤ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا خوف اس افسانے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ معاشرتی ضوابط سے انحراف کی صورت خوف کو جنم دیتی ہے۔"لذت کا خوف" کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"گھر ٹیکس کا آخری مرحلہ بنک میں پیسے جمع کرانا تھا۔ فارغ ہو کر گاڑی میں بیٹھنے لگا تو خیال آیا۔۔۔ وہ مجھ میں اتنی دلچسپی لیتی ہے۔ خوشی ہوئی اور تشویش بھی۔ بیوی اور دو بچوں کے ساتھ اس طرح کے مشغلے ،اس کے بھی تو بچے ہیں ، میاں بھی ٹھیک ٹھاک ہے"۔[۸]

یہ کہانی معاشرے میں اخلاقی پستی کی عکاس ہے۔ جنسی ہوس نے انسان کو حیوان بنا دیا ہے۔ اخلاقی معیار ختم ہو چکا ہے۔ انسان کی شکل میں شیطان چھپے بیٹھے ہیں۔ اس کہانی کے کردار برائی بھی کیے جا رہے ہیں اور معاشرتی بدنامی سے خائف بھی ہیں۔ یہی لوگ معاشرے کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ ہمارے کلچر میں مرد

عورت کا ملاپ آسان ہوتا جارہا ہے۔ یہ افسانہ میاں بیوی کے درمیان رشتوں کے بندھن کے ٹوٹ جانے کے خوف کو سامنے لاتا ہے۔ رشتوں کا بندھن اعتماد سے مضبوط رہتا ہے۔ جب اعتماد کو ٹھیس پہنچ جائے تو مضبوط سے مضبوط رشتے میں بھی دراڑ آجاتی ہے۔

"سب ٹھیک ہے۔۔۔ ڈر یہ ہے کہ اگر کبھی لذت کے نشے میں منہ سے نام نکل گیا تو ۔۔۔۔؟"۔ (۹)

ہمارے سماج میں ایسے بہت سی مثالیں ملتی ہیں جس میں میاں بیوی کے درمیان لڑائی کی بنیاد ان کے غیر مرد و عورت سے تعلقات ہوتے ہیں۔ جب ان کی نشاندہی ہو جاتی ہے تو بگاڑ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ بچوں کی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں اور معاشرے میں باعزت ہونے کی سند ختم ہو جاتی ہے۔ یہ افسانہ بھی جنسی لذت کے نتائج سے خوفزدہ کرتا ہے۔ جو کسی بھی وقت تذلیل کا سبب بن سکتے ہیں۔

معاشرے میں ایسے واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں جو فرد کو ایک ہی وقت میں مختلف قسم کے خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ "دکھ ایک چڑیا ہے" کہانی فرد کی خائف زدہ صورت حال کو مختلف زاویوں سے سامنے لاتی ہے۔ معاشرتی نظام میں مجرمانہ عناصر کی بدولت ایک عام شہری کس حد تک پریشان ہے، اس افسانے میں خوبصورتی سے واضح کیا گیا ہے۔ کسی بھی معاشرے کا نظم و نسق اس وقت تک بہترین نہیں چل سکتا جب تک اس سے جرائم کا خاتمہ نا ہو۔ عام آدمی کو اس بات کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ جرائم پیشہ عناصر کی پشت پناہی ایسے لوگ بھی کر سکتے ہیں، جو خود کو شرافت کے لبادے میں اوڑھے ہوتے ہیں۔

"فٹ پاتھ کے کونے پر ایک پالش والا تھا۔ اس کی طرف بھاگا گیا۔۔۔ میری گاڑی یہاں۔۔۔

پالش والے نے بے نیازی سر اٹھایا۔۔۔ ہاں کھڑی تو تھی۔

تو کدھر گئی۔۔۔ اس کے منہ سے لفظ نہیں نکل رہے تھے۔

پالش والا چند لمحے چپ رہا، یہ چند لمحے قیامت کے تھے۔

دو بندے آئے اور گاڑی لے گئے۔

اور میری بیوی۔۔۔اسے اپنی آواز خود سنائی دے رہی تھی۔

اسے بھی۔۔۔۔"۔(۱۰)

رشید امجد نے اس افسانے میں معاشرتی بے حسی اور بے رحمی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خوف و کرب کو بیان کیا ہے۔ سماجی درندگی کی یہ ایک اعلی مثال ہے جہاں مددگار کا حجاب لگا کر تباہ کار چھپے ہوئے ہیں۔ چوری، ڈکیتی، اغوا جیسے جرائم عام ہو رہے ہیں جن سے معاشرتی زندگی خوف کا شکار ہے۔ یہ افسانہ زندگی کی حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے۔ معاشرتی ناہمواری کے باعث اچھائی اور برائی میں فرق روا نہیں رکھا جارہا۔ سماجی رویوں میں تبدیلی نے انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ انسان دوسرے انسان کی جان و مال کے درپے ہے۔ خوفزدگی کی اس فضا نے انسان کا سکون ختم کر دیا ہے۔ ایک دوسرے سے اعتماد ختم ہوتا جارہا ہے۔ اس افسانے میں ان چہروں کی نشاندہی کی گئی ہے جو معاشرے میں عزت مآب کا درجہ رکھتے ہیں۔ عام آدمی اس کھیل تماشے کو نہیں سمجھ سکتا۔ ان بہروپیوں کی وجہ سے عام آدمی کی زندگی کس قدر خوف وہراس سے دوچار ہے، اس افسانے کا بنیادی موضوع ہے۔

"گاڑی اپنی جگہ تھی اور وہ سر جھکائے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔۔۔

دونوں کچھ نہ بولے۔ اشارے سے نکلے تو بڑی مردہ، افسردہ آواز میں اٹک اٹک کر بولی ۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہوا، بس ہم پہنچے ہی تھے کہ کسی کا فون آیا اور وہ مجھے یہاں چھوڑ گئے۔

وہ کچھ نہیں بولا۔

اسے احساس ہوا کہ شاید وہ اپنی بات نہیں کر پائی، بولی۔۔کچھ بھی نہیں ہوا، انہوں نے کچھ نہیں کیا۔"۔(۱۱)

اس کہانی میں محبت اور خلوص جیسے جذبات شامل ہیں، ان جذبوں کی ڈور ہمیشہ اعتماد پر ہوتی ہے۔ ذرا سی بے اعتمادی رشتوں میں دوری کا باعث بنتی ہے، رشید امجد اس نزاکت کو خوبصورتی سے اس کہانی میں بیان کرتے ہیں۔ میاں بیوی کا ایک دوسرے پر اعتماد ہی رشتے کی پائیداری کی ضمانت ہے۔ معاشرتی بے راہ روی سے رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اگر اعتماد پختہ ہو تو فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔

ii. جغرافیائی خوف

ہر سماج کی اپنی جغرافیائی حدود ہوتی ہیں ۔ جہاں زندگی معمول کے مطابق گزرتی رہتی ہے ۔ ایسی صورت میں فرد اپنے گھر، محلے، علاقے سے قربت اور انسیت میں جذباتی ہو جاتا ہے۔ سماجی دائرے سے نکلنا انتہائی مشکل ہوتا ہے ۔ بعض افراد کے لئے اس دائرے سے نکلنا بہت دکھ اور تکلیف کا باعث بنتا ہے ، بالخصوص بڑھاپے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا ردعمل انتہائی تکلیف دہ ہے۔ رشید امجد کے کردار ان بوڑھے والدین کی خوفزدہ صورتحال کے عکاس ہیں جو اپنے بچوں کی خوشی کے لئے جغرافیائی حدود پھلانگ جاتے ہیں ۔ پھر ایک انجانا خوف ان پر طاری ہو جاتا ہے جیسے ان سے زندگی کا حسن چھین لیا گیا ہو۔ علاقائی وابستگی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ فرد مرنے کے بعد بھی آبائی جگہ دفن ہونے کو ترجیح دیتا ہے۔ والدین تمام عمر اولاد کی خوشی کا سامان باندھتے ہیں۔ یہ افسانہ بھی اسی کڑی سے جڑا ہے۔

"باپ کا دل مسوس کر رہ گیا، آنکھیں نم ہو گئیں اگر میری ڈیتھ ہو گئی تو مجھے گاؤں لے جانا"۔۔۔

باپ نے سوچا یہاں کے قبرستان بھی ان فلیٹوں کی طرح ہوں گے ، ساتھ والی قبر میں کون ہے اور آس پاس کیا ہے، اس کی بھی خبر نہیں ہو گی"۔ [۱۲]

"مٹی کی مہک" میں شہری زندگی کی گھٹن، افراتفری، مشینی ماحول، تنگ دلی جیسی کیفیات کو سامنے لایا گیا ہے۔ یہ افسانہ ایک طرز زندگی سے دوسری طرز زندگی کی طرف ڈھلنے کی ناکام کوشش کی طرف اشارہ ہے۔ اولاد اپنی معاشی مجبوریوں کے لئے والدین کو ساتھ تو لے آتی ہے مگر وہ یہ نہیں سوچتے کہ آیا ان کے والدین خوش ہیں یا نہیں۔ انہیں کسی قسم کا خوف تو نہیں؟ والدین ہمیشہ اپنی خوشی کو اولاد پر قربان کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، اس خوف کے باوجود بھی کہ وہ خوش نہیں ہیں۔ رشید امجد نے اپنی بیشتر کہانیوں کے عنوانات میں کہانی کے مرکزی خیال کو مقید کر دیا ہے، "مٹی کی مہک" اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جو حب الوطنی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید "دکھ ایک چڑیا ہے" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

"انہوں نے ان بوڑھے والدین کے کرب کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جن کے بچے اپنا مستقبل بنانے کے لئے ملک سے باہر چلے جاتے ہیں اور بوڑھے والدین کو تنہا چھوڑ جاتے ہیں"۔ (۱۳)

جغرافیائی حدود صرف دیہی اور شہری زندگی تک محدود نہیں بلکہ ریاستی حدود کا عبور کرنا بھی خوف اور کرب کا باعث بنتا ہے۔ لوگ معاش کے حصول کے لئے بیرونِ ملک جانے کو ترجیح دیتے ہیں اور پھر وہاں مستقل سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔ بوڑھے والدین جنہوں نے پوری عمر اولاد کے لئے وقف کر دی ہوتی ہے اس کا صلہ خدمت کی بجائے ان کے دور جانے کے خوف کی صورت میں ملتا ہے۔ رشید امجد "گماں کے رشتے" میں زندگی کے ان حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں جو ہمارے سماج میں بہت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ رشتوں کے درمیان بڑھتے خلا کا خدشہ ہر دوسرے گھر کی کہانی ہے۔ نئی جنریشن ذاتی مفاد کے چکر میں والدین جیسے پاکیزہ رشتوں کو بھی چھوڑ رہی ہے۔ احساسات ختم ہو رہے ہیں۔ بڑھاپا خود ایک بیماری ہے۔ اولاد کا بیرون ملک جانے سے بوڑھے والدین مایوسی، تنہائی، افسردگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ گھروں کی دیواریں انہیں خوفزدہ کرتی ہیں۔ پل پل دکھ میں گزرتا ہے۔ رشید امجد ایسی صورتحال سے باخبر ہے۔

"ہمارے ساتھ کون ہو گا"۔

بیوی پھر بھی چپ رہی۔ وہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ بیٹے کی شادی باہر ہو لیکن بیٹے نے صاف صاف کہہ دیا۔ "مجھے آگے پڑھنا ہے، میرا کیرئیر ہے یہاں کیا رکھا ہے"۔ (۱۴)

والدین جب عمر کے ایسے حصے میں پہنچ جائیں جب انہیں سہارے کی ضرورت ہو تو اولاد کی دوری برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کے لئے ہر لمحہ یہی خوف لاحق رہتا ہے کہ ان کی اولاد انہیں چھوڑ کر دور نہ چلی جائے۔ ہمارے سماج میں اولاد کے رویوں نے والدین کو خوف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ جدید مشینی دور میں رشتوں کی پاسداری کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ جیسے جیسے لوگ تنگ گھروں میں رہنے پر مجبور ہیں ایسے ہی لوگوں کے دل کی گلیاں بھی تنگ ہو رہی ہیں۔ خاندانی نظام کی دیوار گر رہی ہے۔ مادیت پرستی نے رشتوں کو تہس نہس کر دیا ہے۔ "کچھوے کی موت" کلی و جزوی طور پر ڈگمگاتی کشتی کو ساحل پر لانے کی کوشش ہے۔ اس کہانی کا عنوان انجانے خوف کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو دور حاضر میں گھر گھر کی کہانی ہے۔ فرد کا باطن مفلوج ہو چکا ہے۔ لیکن وہ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

"سب ٹھیک چل رہا تھا کہ ایک رات کھانا کھاتے ہوئے بیٹے نے اعلان کیا کہ اسے باہر نوکری مل گئی ہے۔

چمچ اس کے ہاتھ میں رہ گیا........"لیکن تم یہاں بھی ٹھیک ہو"۔

بیٹا ہنس پڑا......"ابو جس کو موقع ملتا ہے یہاں سے جا رہا ہے۔ یہاں کیا رکھا ہے؟"

لیکن اپنا ملک تو ہے۔ بیوی آہستہ سے بولی۔"۔[۱۵]

جدید زندگی میں مٹی کی محبت کا عنصر کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ نئی نسل کی ترجیحات بدل چکی ہیں۔ لیکن پرانے لوگوں میں مٹی، وطن، علاقہ کی وابستگی ابھی بھی باقی ہے۔ "کچھوے کی موت" ایسی ہی کہانی ہے جس میں نئی اور پرانی نسل کی ترجیحات کی عکاسی کی گئی ہے۔ پرانے لوگ اپنا وطن چھوڑنے کو تیار نہیں۔ کیوں کہ وہ اپنے رشتہ داروں، دوستوں، محلہ داروں کے ساتھ ایک خاندان کی صورت میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ بیرون ملک ایک انجان جگہ جانے سے خائف ہیں۔ شام کی بیٹھک، دوستوں کی محفلیں وہاں کب میسر آتی ہیں۔ اسی خوف کے پیش نظر اپنا ماحول چھوڑنا کسی کرب سے کم نہیں۔ پردیس کتنا بھی پُر آسائش کیوں نہ ہو پردیس ہوتا ہے۔

"اب اپنی مٹی سے میرا رابطہ یہ چینل ہی ہیں۔" وہ بیوی سے کہتا۔ وہ کبھی چپ رہتی، کبھی کہتی......"چلو خبروں کا تمہارا چسکا تو پورا ہو جاتا ہے۔"

وہ ہنس پڑتا......لیکن ان خبروں پر تبصروں کے لئے تو یہاں کوئی نہیں۔"[۱۶]

رشید امجد سماجی بدلاؤ اور ان سے پیدا ہونے والے اثرات کو کہانی میں ڈھالنے پر خاصی دسترس رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں بیک وقت کئی موضوعات جنم لیتے ہیں۔ ہر موضوع کی انفرادیت ان کے خاص اسلوب سے عیاں ہوتی ہے۔ وہ کشادہ گھروں اور فلیٹ زدہ زندگی کا بہ خوبی موازنہ کرتے ہیں۔ زندگی کی روشنی کو مختلف زاویوں سے تلاش کرتے ہیں۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان کس طرح ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں خود کو انجانے خوف میں مبتلا کر لیتا ہے۔ اس افسانے میں اپنی مٹی سے مراد اپنا ملک، علاقہ، محلہ ہے۔ پردیس میں یہ اپنائیت کہاں ملتی ہے۔ یہی اپنائیت اپنی مٹی سے دور جانے کا خوف پیدا کرتی ہے۔

انسان جہاں رچ بس جائے وہاں گھر کے علاوہ اس علاقے کا کلچر، تہذیب، زبان سب سے دوری ناممکن ہو جاتی ہے۔

iii. عدم شناخت کا خوف

فرد اپنی پوری زندگی شناخت اور عدم شناخت کی کشمکش میں گزار دیتا ہے۔ شناخت کا مسئلہ رشید امجد کے ہاں ہمیشہ سے رہا ہے۔ ان کے افسانوں میں فرد کی پہچان کو مختلف زاویوں میں بیان کیا گیا ہے۔ شناخت اور عدم شناخت کا مسئلہ ان کے فلسفیانہ تفکر کا عکاس ہے۔ ان کے ہاں فرد اپنی پہچان میں ہچکولے کھاتا ہے۔ وہ زندگی کی حقیقیت کو تسلیم بھی کرتے ہیں اور اس کے انکاری بھی ہیں۔ رشید امجد کا فرد جسم اور روح کے جوڑ میں گم ہے، اس کو یہ خبر نہیں کہ اصل روح ہے یا جسم۔ پھر فرد اپنی پہچان کیسے کرے۔ ڈاکٹر نوازش علی لکھتے ہیں کہ رشید امجد کے افسانوں میں عدم تشخص پہلے اس کی ذات کا مسئلہ بنتا ہے، پھر ذات سے پورے سماج کی شناخت گم ہو جاتی ہے۔ (۱۷) شناخت کو تلاش کرتے کرتے رشید امجد خارج سے داخل میں جھانکتے ہیں۔ جسم سے روح کی طرف نظر دوڑاتے ہیں۔ موجود اور ناموجود، ہونے نہ ہونے کی کشمکش بڑھتی جاتی ہے۔ سائنس اور مذہب دونوں سے فرد کی حقیقت تلاش کرتے ہیں۔

> "بات یوں چلی کہ نام اور پہچان کا تعلق جسم سے ہے یا اس بے نام شے سے جو جسم کو وجود بناتی ہے۔ جس کے بغیر جسم بے حس و حرکت مٹی کا ایک ڈھیر ہے جسے یا تو کیڑے مکوڑے کھا جاتے ہیں یا خاک کے ساتھ خاک ہو جاتا ہے۔۔۔ تو پھر نام اور پہچان کا تعلق کس ہے ؟ بے نام سی شے جو جسم کو وجود بناتی ہے کوئی نام اور پہچان نہیں رکھتی"۔ (۱۸)

یہ افسانہ انسانی تاریخ کا بیانیہ بھی ہے اور مستقبل شناس بھی۔ انسان ہزاروں سال سے دنیا پر آ رہا ہے اور جا رہا ہے۔ اس کا نام، مرتبہ سب ایک مخصوص وقت تک ہے۔ اس کے بعد سب فنا ہے۔ جسم اور روح کا کھیل جاری ہے۔ بغیر پوچھے یہ تعلق قائم ہو رہا ہے اور بغیر پوچھے تعلق ختم ہو رہا ہے۔ پھر اس سارے کھیل میں انسان کی پہچان کہاں ہے؟ انسان کی بے بسی اسے عدم شناخت کے خوف میں مبتلا کرتی ہے۔

فرد کی زندگی بچپن سے بڑھاپے تک کے سفر کا نام ہے۔ یہ اٹل حقیقت ہے جو درجہ بدرجہ سامنے آتی ہے۔ کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ ہر درجے کی اپنی خصوصیات ہیں۔ "فالتو آدمی" بڑھاپے کی حقیقت کو سامنے لاتی کہانی ہے۔ فرد جو جوانی میں سب گھر، خاندان، احباب کا منظور نظر ہوتا تھا، اب مفرور نظر ہے۔ رشید امجد کے ہاں کہانی کا عنوان خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ سماجی و نفسیاتی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے کہانی کا عنوان تجویز کرتے ہیں۔ "فالتو آدمی" بھی ایسی ایک کہانی ہے جس سے فرد کی تنہائی اور بے بسی عیاں ہے۔ وقت بے رحم چکی ہے جس میں طاقت، مرتبہ، نام، جلال، شان و شوکت، جوانمردی سب نے آہستہ آہستہ پِس جانا ہے۔ یہ کہانی سماجی بے راروی کی عمدی مثال ہے۔ طبقاتی تقسیم نے فرد کو تنہا کر دیا ہے۔ سماج مختلف کلاسز میں منقسم ہو چکا ہے۔ ایک کلاس کا فرد دوسری کلاس میں جب جانے کی کوشش کرتا ہے تو اسے قریب نہیں آنے دیا جاتا۔ سماجی نظام میں تقسیم میں عام آدمی کے لئے ترقی کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ مافیا کی ہر فورم پر اجارہ داری ہے۔

> "مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟" یہ خیال بار بار ستاتا۔ کرداروں کے ہجوم میں وہ کبھی ایک طرف ہوتا، کبھی غلطی سے درمیان میں آجاتا تو وہ کہنیاں مار مار کر اسے کنارے کی طرف دھکیل دیتے"۔ (۱۹)

سماج میں فرد کی پہچان اور اہمیت اس وقت تک ہے جب تک وہ دوسروں کے لئے کارآمد ہے، جب وہ اس کے کسی کام نہیں آسکتا تو اس کی شناخت بھی ختم ہوتی جاتی ہے۔ سماج کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ فرد کی شناخت عدم شناخت میں بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ گھر میں بھی ریٹائیرمنٹ کے بعد گھر میں بھی مقام بدل جاتا ہے۔ بڑھاپا بوجھ بن جاتا ہے۔ یہ ہمارے سماج میں گھر گھر کی کہانی ہے۔ ڈھلتی عمر میں بے کار ہو جانے کے خوف نے فرد کو ذہنی کرب میں مبتلا کر دیا ہے۔ رشید امجد زندگی کے اس حصے کی بات کرتے ہیں جب انسان کی جسمانی صلاحیتیں جواب دے جاتی ہیں۔ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔ کسی کام کے لائق نہیں۔ دراصل یہ ایسا خوف ہے کہ فرد کی اہمیت کو ختم کر دیتا ہے۔ جو لوگ ہمہ وقت آگے پیچھے رہتے تھے، بڑھاپے میں سب دور ہو گئے۔ جوانی میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا لیکن وقت نے اس کی شناخت کو پسِ پردہ کر دیا۔ عجیب گورکھ دھندہ ہے۔ وقت کا بہاؤ اپنے ساتھ شناخت کو بھی بہالے جاتا ہے۔

> "زندگی کا یہ دور کتنا تکلیف دہ ہے؟" خیال آتا، سوچتا۔۔۔ "میرا کوئی رول نہیں"

بیوی سے کہا۔۔۔ " جب کسی آدمی کا کردار ختم ہو جاتا ہے تو وہ کیوں موجود رہتا ہے"۔ (۲۰)

جدید دور میں یہ مسئلہ زیادہ تقویت پکڑ رہا ہے جہاں فرد کا بڑھاپا اس کے لئے وبال جان سے کم نہیں۔ اولاد بوڑھے ماں باپ کو اولڈ ہاوسز اور یتیم خانوں میں چھوڑ رہی ہے۔ یہاں تو ماں اور باپ ہونے کی شناخت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ کہانی کسی ایک کردار سے متعلق نہیں بلکہ ہر اس کردار سے وابستہ ہے جہاں بڑھاپے میں انسان کی قدر نہیں۔ قدر سے پہچان بنتی ہے اور پہچان سے رشتوں میں مضبوطی آتی ہے۔

iv. دہشت گردی کا خوف

دہشت گردی نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ دھماکے، ٹارگٹ کلنگ اور خودکش بمباری نے معاشرتی زندگی تباہ کر دی ہے۔ عدم تحفظ کی فضا پیدا ہو چکی ہے، ہر شخص کو اپنی جان و مال کا خطرہ ہے۔ دہشت گردی کے پیچھے ملکی و غیر ملکی عناصر کار فرما ہوتے ہیں جو اپنے مفادات کی خاطر بے قصور لوگوں کو موت کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید لکھتے ہیں کہ " دیگر بہت سے عوامل کے علاوہ پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی کے واقعات نے بھی رشید امجد کو متاثر کیا ہے"۔ (۲۱) نائن الیون واقعے کے بعد پاکستان میں دہشت گردی کا خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ سماجی استحصالی، خوف، بے یقینی میں اضافہ ہوتا گیا۔ نائن الیون کے بعد دنیا کا منظر نامہ تبدیل ہو گیا۔ امریکہ نے افغانستان پر اپنا تسلط قائم کرنا شروع کر دیا۔ پاکستان کو دہشت گردی کے نام پر حلیف بنایا گیا۔ پاکستان افغان سرحد کی وجہ سے پاکستان کا علاقہ دہشت گردوں کی پناہ گاہ سمجھا گیا اور وہاں آپریشن شروع کر دیا گیا۔ یہ مشرف کے مارشل لا کا دور تھا۔ آپریشن کا ردعمل سخت آیا اور ملک کے کونے کونے میں دھماکوں اور خودکش حملوں کی لائن لگ گئی۔ زندگی عدم تحفظ کا شکار ہو گئی۔ رشید امجد ان حالات کا حصہ تھے۔ ان کی کہانیاں اس خوف کو اجاگر کرتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔۔۔" اب دشمن نظر ہی نہیں آتا، دھماکہ ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کھڑے نے خودکش بیلٹ باندھ رکھی تھی۔ نہ مارنے والے کو معلوم کہ وہ کیوں دوسروں کو مار رہا ہے نہ مرنے والے کو پتہ کہ ان کا قصور کیا ہے"۔ (۲۲)

آج کا انسان، انسان دشمنی میں سب تقاضے بھول چکا ہے۔ مذہبی تفرقہ بازی، نسلی امتیاز، عالمی سازشیں، ریاستی بالادستی نے دہشت گردی کو فروغ دیا ہے جس سے عام آدمی تباہ ہوا ہے۔ عبادت گاہیں، اڈے، تعلیمی ادارے، تفریح گاہیں، کاروباری مراکز نیز کوئی بھی جگہ محفوظ نہیں۔ ہر جگہ دہشت گردی کا خوف منڈلاتا رہتا ہے۔ مشرف کے آمریتی دور سے لے کر اب تک دہشت گردی کی جڑیں ختم نہیں ہوئیں۔

درجہ بدرجہ دہشت گردی کے سامان کی تجدید ہوتی رہی۔ انسان نے سائنس میں خاطر خواہ ترقی کر لی جس میں انسان کو مارنے کا سامان زیادہ پُر اثر ہوتا گیا۔ پہلے زمانوں میں جو کام سینکڑوں حملہ آور نہیں کر پاتے تھے اب ایک بمبار کر دیتا ہے۔ رشید امجد دہشت گردی کی وجہ سے پیدا کردہ ملکی حالات کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ بے یقینی اس حد تک بڑھ گئی کے گھر سے نکلنے کے بعد زندہ واپسی ہو گی یا نہیں۔ خوف کا یہ عالم کہ مسجدوں میں نماز کے لئے بھی ڈر لگتا کہ کہیں دھماکا نہ ہو جائے۔ مائیں بچوں کو سکول روانہ کر کے سلامتی کی دعائیں کرتی نہیں تھکتی ہیں۔ ایک دھماکے میں سینکڑوں افراد دیکھتے ہی دیکھتے روئی کی طرح بکھر جاتے۔ شہر سنسان ہو گئے۔ رشید امجد دہشت زدہ حالات اور ہولناکی کے منظر کو اپنے افسانے 'ہنوز خواب میں' میں قلم بند کرتے ہیں:

> اب شہر کا یہی حال تھا کہ صبح گھر سے نکلے تو معلوم نہیں کون کون واپس آئے گا اور کس کس کی صرف خبر معلوم ہو گی۔ کفن فروش الگ پریشان کہ کفن کی ضرورت ہی نہیں اور گورکن الگ پریشان کی قبر کی بھی ضرورت نہیں، ہر طرف مندی ہی مندی تھی۔"(۲۳)

رشید امجد ماضی کو حال سے جوڑتے ہوئے مستقبل پر نظر دوڑاتے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس ان کی ذہنی بصیرت کا عکاس ہے۔ انسان دشمنی ازل سے ہے اور رہے گی۔ یہ مخصوص زماں و مکاں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ دہشت گردی نے گھروں کے گھر تباہ کر دیے، نسلیں اجاڑ دیں۔ ہر طرف سناٹا، کرب، لاچاری۔ خوف ہی خوف۔

> " پھر کہنے لگا۔۔۔ آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔
>
> پاکستان سے

اوہ، پاکستان، وہاں تو ہر وقت ڈزڈز ہوتی ہے اس نے انگلیوں سے پستول کی شکل بنائی اور منہ سے ڈزڈز کی آوازیں نکالنے لگا۔ پھر خوب ہنسا"۔ [۲۴]

اکیسویں صدی کا پہلا عشرہ پاکستان میں آئے روز دھماکوں کا دور تھا۔ بد امنی کی فضا پھیلی ہوئی تھی۔ نیوز چینل پر سوائے موت کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دوسرے عشرے میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ دہشت گردی نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا۔ جن کا بس چلتا وہ ملک چھوڑ کے چلا جاتا کہ امن کی زندگی بسر کر سکے۔ رشید امجد نے اپنی کہانیوں میں نہ صرف دہشت گردی کو موضوع بنایا بلکہ بیرون ملک پاکستانیوں کے تاثرات کو بھی سامنے لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ ان کی فنی مہارت ہے کہ ایک افسانے میں کئی پہلوؤں کو ایک ساتھ جوڑے رکھتے ہیں۔ بیرون ملک پاکستانی نژاد کی نئی نسل بھی اس خوف میں مبتلا ہے۔ سعد کا کردار بتاتا ہے کہ وہ پاکستان کو غیر محفوظ ملک سمجھتا ہے، جہاں ٹارگٹ کلنگ، دھماکے آئے روز بڑھ رہے ہیں۔ اور وہ پاکستان آنے سے ڈرتا ہے۔

"وہاں اتنے دھماکے کیوں ہوتے ہیں؟ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

جی چاہا کہ کہوں تمہاری ہی مہربانیوں سے، تم ہی تو انہیں پیسے دیتے ہو، لیکن چپ رہا، تا دیر چپ رہا، پھر بولا۔۔۔ یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں، ان کو بھی نہیں جو یہ سب کچھ کرتے ہیں"۔ [۲۵]

پاکستان میں دہشت گردی پھیلانے میں غیر ملکی طاقتیں بھی کار فرما ہی ہیں۔ غیر ریاستی دہشت گرد قوتوں کو بیرونی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ پاکستان میں ایسی فضا قائم کر دی گئی جس کے نتیجے میں مسلمان دوسرے مسلمان کا دشمن تصور کیا جانے لگا۔ مرنے اور مارنے والے دونوں شہید ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ مارنے والا بھی جنت کا حقدار بن جاتا ہے اور مرنے والا بھی۔ اصل ذرائع کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔ بیرونی سازشیں ملک میں انتشار پھیلا دیتی ہیں۔ رشید امجد ان عناصر کی نشاندہی کرتے ہیں۔

"شہر کو آگ لگ گئی تھی اور بجھانے والا کوئی نہیں تھا، بس رونا ہی رونا تھا، جانے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی، پیچھے رہ جانے والے آہ وبکا ہی کر سکتے تھے۔

"اپنے کئے کا کوئی علاج نہیں۔" سوچتا، "اور جو بویا ہے وہ تو کاٹنا ہی ہے۔" [۲۶]

دہشت گردی کی وجہ سے معاشرے کی اصل شکل بگڑ چکی ہے۔ رشید امجد ریاستی اداروں پر طنز کرتے ہیں۔ عام شہریوں کا کوئی پُرسان حال نہیں۔ ایجنسیاں کہاں ہیں؟ دہشت گردی ختم کیوں نہیں ہو رہی؟ ایسے بہت سے سوالات جنم لیتے ہیں۔ یہ کیسا خوف ہے جو ختم ہی نہیں ہوتا۔ لوگ اپنوں کو دفنا دفنا کر تھک چکے ہیں۔ کرب، تکلیف، درد سے زندگی کلبلا رہی ہے۔ رشید امجد ریاستی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہیں۔ بیرونی دباؤ سے ملکی ادارے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار چکے ہیں۔ ہم وطنوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے۔ ڈرون حملوں میں کتنے عام شہری جان سے گئے۔ ڈرون حملوں کے رد عمل میں فورسز کو نشانہ بنایا گیا۔ عام شہریوں حتیٰ کہ سکول کے بچوں کو بھی دہشت گردی کا سامنا کرنا پڑا۔

ب۔ رشید امجد کے افسانوں میں خوف کے نفسیاتی تناظرات

رشید امجد معاصر زندگی کے نباض افسانہ نگار ہیں۔ فرد کے نفسیاتی محرکات کے نتیجے میں پیدا ہونے والا خوف ان کی کہانیوں کا خاص موضوع ہے۔ خارجی ماحول انسان کے داخل تک سرایت کر جائے تو اندر کی دنیا میں اندیشے، وسوسے اور واہمے گھر کر جاتے ہیں۔ خوف کی کیفیت میں کون سے نفسیاتی محرکات شامل ہیں، ان کا جزوی طور پر تجزیہ کیا گیا ہے۔

i. موت کا خوف

فرد کی حیات موت کی امانت ہے، یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ انسان عمر بھر اپنی ذات اور دوسروں کے لئے تگ و دو میں رہتا ہے۔ اپنی راحت، سکون کے ساماں پیدا کرتا ہے۔ زندگی کو پُر آسائش بنانے کے لئے محنت اور مشقت سے کام کرتا ہے۔ لیکن سب کچھ کرنے کے باوجود موت کے آنے کا خوف طاری رہتا ہے۔ بچپن سے فرد کے لاشعور میں موت کا خوف ڈال دیا جاتا ہے۔ بڑھاپے میں یہ خوف زور پکڑ لیتا ہے اور ہر نیا دن زندگی کی کمی کا باعث بنتا ہے۔ رشید امجد نے "مسکراتے لمحے سے نکلتی افسردہ کہانی" میں موت کے خوف کو بہ خوبی بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر صفیہ عباد لکھتی ہیں "وہ موت کے موضوع کو ہر زاویے سے دیکھتے، پرکھتے اور تجزیہ کرتے ہیں"۔ [۲۷] یہ کہانی فرد کی پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ انسان دنیاوی معاملات میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اسے بوڑھے ہونے اور مرنے کا ہوش نہیں رہتا۔ زندگی کے مشاہدے کو اس کہانی میں بہ خوبی بیان کیا گیا ہے۔ فرد بلندی کی طرف دوڑتا ہے لیکن در اصل اس کی دوڑ پستی کی طرف ہے۔ کہانی کا

مرکزی کردار کلی طور پر خوفزدہ ہے۔ وہ زندگی کے شب و روز دیکھ چکا ہے۔ بالآخر فنا ہے۔ رشید امجد تشویش ظاہر کرتا ہے کہ لوگ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ سب نے اس کی جگہ لینی ہے اور وہ اپنے سے پہلے جانے والوں کی جگہ لے گا۔ زندگی کی رنگینی عارضی ہے۔

"وہ کھانے کی میز پر بیٹھے، سب کو ہنستے ایک دوسرے کو چھیڑتے، دیکھ کر سوچتا، یہ ابھی زندگی سے لبالب بھرے ہیں، ان کو واپسی کا خیال ہی نہیں، انہیں آگے اور آگے جانے کی جلدی ہے۔۔۔ اور میں، میں تو سفر کے آخری حصے میں ہوں۔۔۔ واپسی اور سفر کے ختم ہونے کا تصور ہی اداس کر دینے والا ہے۔ ایک زمانے میں اس کا خیال ہی نہیں ہوتا۔ لیکن اب وقت آگیا تھا کہ یہ خیال سب خیالوں پر حاوی ہو گیا تھا۔ واپسی۔ سڑک ختم ہونے والی ہے۔ آگے کھائی یا پُل۔ دل ڈوبنے لگتا ہے"۔[۲۸]

جوانی کا دور زندگی کا حسین دور تصور کیا جاتا ہے، محنت مشقت کا دور، محبت و عشق کا دور، کام کاج کا دور۔ لیکن کچھ وقفے بعد سب ترتیب الٹ ہو جاتی ہے۔ بلندی سے پستی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ ذہن الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور پھر لاشعور میں بیٹھا موت کا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ پچھلی عمر میں سوائے مرنے کے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ رشید امجد نے خوبصورتی سے اس نفسیاتی مسئلے کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ رشید امجد کے ہاں موت کے موضوع کے کئی پہلو ہیں۔ موت ان کے لاشعور میں ہے۔ موت کو وہ وسیع معنوں میں لیتے ہیں۔ زندگی کی رنگارنگی کا خاتمہ بھی موت کا سماں ہے۔ جسم کا ناکارہ ہو جانا بھی موت جیسا ہے۔

"معلوم نہیں مجھے کتنی دیر یہاں رہنا ہے؟" اُس نے سوچا۔ "اور میرا یہ احساس کتنی دیر باقی رہے گا"۔

واپسی بھی اسی طرح کی تاریک سرنگ سے گزر کر۔۔۔ اگلا منظر کیا ہے؟[۲۹]

موت اور ماورائے موت رشید امجد کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ان کا فلسفیانہ تفکر فرد کی داخلی تہہ داریوں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ جہاں انسان کی عارضی زندگی کا نچوڑ موت کی صورت میں نکلتا ہے۔ زندگی کی رنگارنگی کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس کے اختتام تک جا پہنچتے ہیں۔ ڈاکٹر شمیم حنفی کے مطابق رشید امجد کی کہانیوں میں ان کا مشاہداتی عمل پنہاں ہے، جو ان کے ساتھ قاری کو بھی اس عمل کا حصہ دار بناتا ہے[۳۰]۔ رشید امجد کا

فلسفۂ زندگی کے مباحث پر مبنی ہے۔ انسان کا اندھیری دنیا سے آنا اور واپسی کی راہ کا بھی تاریک ہونا، یہ زندگی کی آمد و روانگی کی امتزاجی کیفیات ہیں۔ رشید امجد کا ارتقائی عمل فرد کی داخلی و خارجی ماحول کی بنا پر تغیر پذیر ہے۔

ii. تنہائی کا خوف

حالات و واقعات انسانی زندگی پر بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ زندگی کی کروٹیں یکسر بدل جاتی ہیں۔ انسان ذہنی خلل کا شکار ہو جاتا ہے۔ گھر، دفتر، بازار بلکہ ہر جگہ انسانوں کی بھیڑ میں خود کو تنہا تصور کرتا ہے۔ زندگی کی چہک مہک، روشنی سب ماند لگتی ہیں۔ رشید امجد نے جدید دور کے فرد کی تنہائی کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ یہ فرد کسی ایک سماجی دائرے میں مقید نہیں بلکہ یہ علاقائی و ریاستی حدود کو آسانی سے پار کر لیتا ہے۔ یہ تنہائی انسان کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔ خود کلامی اور خیالات کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ لاشعوری قوتیں تحرک پذیر ہوتی ہیں۔ انسان ایک انجانے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ شعور اور لاشعور کی دھکم پیل ہے۔

> " یہاں اندھیرا ابھی نہیں تھا، روشنی بھی نہیں تھی۔ بس ایک منظر تھا، ویرانی، سنسانی اور وحشت کا، ہر شے ادھڑی ہوئی، بوسیدگی کی حدوں سے گزرتی اپنے انجام کی طرف لپکتی اور ان سب کے درمیان وہ۔ جو ابھی تک حیران تھا کہ اندر سے یہ عمارت اتنی خستہ کیوں ہے؟ اس کے مکیں کہاں ہیں؟ اور یہ خاموشی، جو اب خوف میں بدلتی جا رہی ہے، کہاں سے آ گئی ہے "۔ [۳۱]

رشید امجد کی کہانیوں میں عام آدمی کی زندگی کی بہاریں بھی رقص کرتی ہیں اور خزاں کا موسم بھی ہچکولے کھاتا ہے۔ ان کے ہاں بڑھاپے کی تنہائی انسان کو خود کلامی پر مجبور کر دیتی ہے اور گزشتہ زندگی ورق در ورق روز بروز کھلتی رہتی ہے۔ پچھتاوے اور افسوس کے بادل منڈلاتے رہتے ہیں۔ " جاتی رت کے خواب " تنہائی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نفسیاتی دباؤ کی کہانی ہے۔ فرد جب اپنوں کی توجہ سے محروم ہو جاتا ہے تو پل پل اذیت بن جاتا ہے۔ جدید دور کی مشینی زندگی نے رشتوں کو کاغذی بنا دیا ہے۔ سارا دن کام کام اور پھر شام کو واپسی پر واجبی سی گفتگو۔ ان رویوں نے بوڑھے ماں باپ کو تنہائی کی بھٹی میں دھکیل دیا ہے، جہاں وہ کبھی ماضی کو یاد کر کے اور کبھی حال سے ناامید ہو کر خود کو جلاتے رہتے ہیں۔

"اور اب عمر کے آخری حصے میں یہ چھوٹا سا کمرہ اور زندگی بھر کے پچھتاوے میرا مقدر ہیں۔ طوطوں کی طرح غراتی بلی کو دیکھ کر گھڑوں میں چھپ جانا۔

شام کو بیٹا بہو اور بچے آتے تو بیٹا پوچھتا۔ "سارا دن کیسا گزرا؟"

وہ کیا جواب دیتا، اداسی سے کہتا۔ بس ایک دن اور گزر گیا"۔ (۳۲)

ہمارے ہاں اولاد کا بیرون ملک چلے جانا بھی والدین کو تنہائی کی تاریک گلی میں پھینک دیتا ہے جہاں سوائے بھٹکنے کے کچھ نہیں۔ یہ فاصلہ نفسیاتی مسائل کا باعث بنتا ہے۔ انسان کی آخری عمر میں توقعات بدل جاتی ہیں، سہارا بننے کی بجائے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تنہائی کا خوف طاری ہو جاتا ہے۔ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی نفسیاتی طور پر خود کو تنہا تصور کر لیتا ہے۔ بعض اوقات یہ خوف اس حد تک حاوی ہو جاتا ہے کہ انسان زندگی سے فرار کی راہیں تلاش کرتا ہے۔ خارجی حالات داخل پر منکشف ہونے سے اندر کی دنیا میں طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ امید اور ناامیدی کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ سب کے ہوتے ہوئے بھی کوئی نہیں ہوتا۔ کمرہ قید خانہ بن جاتا ہے۔ ایسی قید کہ جس سے فرار بھی ممکن نہیں۔

"بیٹے نے کہا۔ "آپ لوگ بھی چلیں' یہاں اکیلے کیسے رہیں گے"

اُس نے بیٹے کی طرف دیکھا اور آہستہ بولا۔ "بیٹا وہاں تو لوگ بھی گونگے ہیں اور یہاں دیواریں بھی باتیں کرتی ہیں"(۳۳)

فرد کی گھر اور گھریلو اشیاء سے مانوسیت کی شدت اس کی نفسیات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ گھر کے در و دیوار سے بھی محبت اور اپنائیت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں تنہائی کو دو زاویوں سے دکھایا گیا ہے ایک اپنے گھر میں اکیلا پن تو ہے لیکن گھر کا ماحول اس کی تنہائی میں کمی کا باعث بن رہا ہے دوسرا ایک انجان جگہ جا کر تنہا رہنے کا خوف۔ جہاں ایسا گھریلو ماحول، احباب، پڑوس وغیرہ میسر نہیں آئیں گے۔ یہ کہانی انسان کی ماحول دوستی کی عمدہ مثال ہے۔ رشید امجد دو سماجوں کا افتراق بہ خوبی بیان کرتے ہیں۔ کہانی ایک سمت جاتے جاتے دوسری طرف پلٹ جاتی ہے۔ یہ کہانی کم اور ذاتی مشاہدہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

"آسمان کو چھوتی عمارتیں، سڑکوں پہ تیز دوڑتی شور مچاتی گاڑیاں اور لوگوں کے اژدحام میں بھی وہ اکیلا اور سونا سونا سا تھا۔ شاپنگ مالوں میں کندھے سے کندھا چھوتے ہجوم اسے اپنا آپ تنہا اور اجنبی لگتا"۔ (۳۴)

اس کہانی کا فرد جسمانی و ذہنی طور پر تھکا ہوا ہے۔ اندر ہی اندر سلگتی آگ میں جل رہا ہے۔ باہر کی دنیا کی گہما گہمی، رونق، ہجوم سب سے بے خبر۔ اپنی دھن میں مست۔ تنہائی ہی تنہائی۔ بازاروں میں چلتے لوگوں کا شور، سڑکوں پر رواں گاڑیوں کے ہارن، سب سے بے نیاز۔ یہ کیفیت ایسے پیدا نہیں ہوتی۔ سماج نے فرد کو فراموش کر دیا ہے۔ جس کیا نتیجہ ایسی کیفیت ہے۔ تنہائی کا خوف اس قدر شدید ہے کہ دماغ شل ہو چکا ہے۔ رشید امجد کی کہانیاں ان کے تجربات کی دلیل ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے کہانی میں کردار نہیں مصنف کی آپ بیتی ہے۔ رشید امجد فرد کی تنہائی کے بارے 'موسمِ بہار میں سوکھی ٹہنیاں' میں لکھتے ہیں:

" چہرے کے بڑھتے پیلے پن اور اندر ہی اندر دھنستی آنکھوں نے بیٹے کو کچھ پریشان کر دیا، بولا "لگتا ہے آپ کچھ مطمئن نہیں"

نہیں تو اس کے لفظ کھوکھلے تھے کہ خود اسے احساس ہوا ہے کہ جھوٹ بول رہا ہے۔

" سارے دن کا اکیلا پن " بیٹا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔" تنہائی بھی ایک عذاب ہے"۔ (۳۵)

معاصر زندگی میں گھروں کا نقشہ بدل چکا ہے۔ بزرگ سارا دن گھر میں اکیلے رہنے پر مجبور ہیں۔ جس سے مسلسل اداسی، جبریت، تنہائی نے فرد کی ذہنی و جسمانی صورت کو بدل دیا ہے۔ اکیلا پن نے فرد کو نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔ گھر کی دیواریں خوف کا سماں پیدا کرتی ہیں۔ ٹی وی دیکھ دیکھ کر اکتاہٹ پیدا ہو چکی ہے۔ رشید امجد کی ان کہانیوں سے اندازہ ہوتا ہے جیسے یہ ان کے ذاتی مشاہدات ہیں۔ جو کہانی میں لاشعوری قوت بن کر سامنے آتے ہیں۔ رشید امجد "پرندہ اداس ہے" میں لکھتے ہیں:

"اب چھ کمروں کا گھر دو اکیلے میاں بیوی اور ان ہی کی طرح کا بوڑھا ملازم۔ پرندہ بھی شاید بوڑھا ہو گیا ہے۔ اکثر چونچ پروں میں دبائے بیٹھا رہتا ہے، اسی کی طرح سارا دن

اونگھتے اونگھتے گزار دیتا ہے۔ پانچ کمرے لاک ہیں، ایک بیڈ روم استعمال ہوتا ہے اور ملازم کا کمرہ، ڈرئنگ روم کے صوفوں پر سفید چادریں ڈال دی گئی ہیں کہ کبھی کبھار ہی کوئی آتا ہے"۔(۳۶)

مندرجہ اقتباس میں رشید امجد نے تنہازدہ گھر کا نقشہ کھینچا ہے۔ جہاں چاروں طرف سوائے کرب، درد، تکلیف کے کچھ نہیں۔ اس افسانے میں پرندے کی علامت استعمال کر کے فرد اور اس سے وابستہ زندگیوں کی تلخ اور خوفزدہ حقیقت کی منظر کشی کی گئی ہے۔ رشتوں کی پامالی کے نتیجے میں نفسیاتی دباؤ دن بدن بڑھ رہا ہے۔ جسے اس کہانی میں عمدگی سے نمایاں کیا گیا ہے۔

iii. مابعد الطبعیاتی خوف

انسان کی علمی بصیرت اور دانش نے انسانی وجود سے متعلق کئی سوالات سامنے لائے اور ان کے جوابات دینے کی کوشش کی۔ مختلف طبقہ فکر نے اپنے تصورات کو مخصوص انداز میں پیش کیا۔ جن میں ایک طبقہ مادیت پرست کہلایا جس کے مطابق مادہ اصل حقیقت ہے، ان مادیت پرستوں میں بھی آپسی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ دوسرا طبقہ مثالیت پسند کہلایا جس نے غیر مادی وجود کو حقیقت قرار دیا، ان کے تصورات میں بھی اختلافات ملتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اصل مسئلہ انسان کے وجود کا ہے۔

رشید امجد نے اس فلسفیانہ تفکر کو اپنی کہانیوں کا بہ طور خاص موضوع بنایا، انسان ایک جسم رکھتا ہے جس میں مادہ کی حقیقت شامل ہے لیکن یہی انسان اگر مر جائے تو اس کا جسم خاک کے ساتھ خاک ہو جاتا ہے ۔مرنے کے بعد انسان کی حیثیت کیا ہو گی؟ یہ رشید امجد کے تفکر کا منبع ہے۔مابعد الطبعیات انسان کی زندگی کیسی ہو گی۔ مختلف مذاہب، نظریات اور تصورات اس پر اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ یہ ہیجانی کیفیت انسان پر طاری رہتی ہے۔ انسان مرنے کے بعد کیسی زندگی گزارے گا، یہ ایک ایسا خوف ہے جو پوشیدہ حالات سے پیدا ہو رہا ہے۔ رشید امجد کی کہانیوں میں سائنس اور مذہب کا امتزاج ملتا ہے۔ جہاں سائنس نے مادہ وجود کو مشاہداتی عمل سے گزارا ہے۔ وہاں مذہب نے روح کی تشریح کی ہے۔ اس کشمکش کو رشید امجد بہ خوبی اپنے موضوعات میں شامل کرتے ہیں۔ ان کے مذہبی رجحان اور جدید سائنسی نظریات سے آگاہی نے کشمکش کی

صورت پیدا کر دی ہے۔ کبھی وہ مرشد سے جواب تلاش کرتے ہیں، کبھی سائنسی لیبارٹری میں ڈی این اے کی کھوج میں لگ جاتے ہیں۔ نفسیاتی کشمکش ان پر طاری ہے جو ایک نکتہ پر نہیں رکتی۔

"بات یوں چلی کہ کہیں پڑھا کہ مرنے کے بعد جسم مٹی کے ساتھ مٹی ہو کر ختم ہو جاتا ہے، اس پر خیال آیا کہ لذت اور ذائقے کا تعلق تو حواس سے ہے جو جسم کا حصہ ہوتے ہیں، تو پھر مرنے کے بعد لذت اور ذائقے کا تصور کیا ہو گا؟"۔ (۳۷)

مرنے کے بعد کی دنیا کسی نے نہیں دیکھی، جو مر چکے وہ واپس نہیں آسکتے اور نہ کچھ بتا سکتے ہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اگر انسان کا جسم ختم ہو جاتا ہے تو پھر کس قسم کا وجود رہ جاتا ہے۔ رشید امجد اس مسئلے کو سائنسی طریقے سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کھانا، پینا، بولنا، سننا سب حواس ہیں، جو جسم کی بدولت ہیں۔ لیکن جسم کے خاتمے کے بعد روح کی حیثیت کیا ہو گی۔ حواس کیسے کام کریں گے۔ یہ سب ایک انجانے خوف میں مبتلا کرتے ہیں کہ کیا اچھا ہو گا یا نہیں۔ انسان کی پسند پوچھی جائے گی یا نہیں۔

"یہ حجرہ تھا کہ جہاں کوئی نہیں آتا تھا اور نہ یہاں سے کہیں جانے کی صورت تھی۔ اسی طرح کے حجرے کے آس پاس دور دور تک پھیلی ہوئی کائنات جو زماں و مکاں سے ماوراء تھی۔ زماں تو بالکل نہیں، البتہ مکاں ہے لیکن یہ کیسا مکاں ہے کہ اس کے ہونے کا احساس تو ہے لیکن اس کی حدود کیسی ہیں اور وہ خود موجود ہے لیکن وجود نہیں رکھتا، بس وجود کا احساس ہے اور ایک خواب ہے۔ بہت ہی طویل، نہ ختم ہونے والا خواب۔ جس کے مناظر بدلتے رہتے ہیں۔ یہ مناظر بہت خوشگوار بھی ہیں اور اذیت دینے والے بھی۔" (۳۸)

"لمحہ ناموجود میں موجود" نفسیاتی کہانی ہے۔ اس میں انسان کی موت کے بعد کی زندگی کو تصوراتی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ رشید امجد کے ہاں قبر کی علامت وسیع معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اس کہانی میں فرد قبر میں کیسی زندگی گزارے گا، فرد کی نفسیاتی کیفیات کو سامنے لانے کی عمدہ مثال ہے۔ جب انسان مادی دنیا سے باہر نکل کر اگلی دنیا کی طرف سوچنا شروع کر دیتا ہے تو اس کی کیفیات تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس کے رویے میں بدلاؤ آجاتا ہے۔ یہاں بھی قبر کی زندگی کا ڈر سامنے آتا ہے۔ آخر ہو گا کیا؟ کیا وہاں بھی کر بنا کی،

اذیت، مشکلات، دکھ، تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا یا کہیں سکون میسر آئے گا۔ یہ طبعیاتی اور مابعد الطبعیاتی دنیاؤں میں تفریق کی نمائندہ کہانی ہے جو انجام کے خوف کو اجاگر کرتی ہے۔

"کہانی کبھی ختم نہیں ہوتی، اس کے ایک ایک مرحلے کا حساب رکھا جاتا ہے" مرشد نے کہا۔۔۔ "سی ڈیاں اپنا وقت پورا کر لیں تو وقت کے کچرے کے ڈھیر پر پھینک دی جاتی ہیں، اُس دن کے انتظار میں، جس نے بہر حال آنا ہے اور جس دن ان سے ہمیں ایک بار پھر نکالا جائے گا۔ بے شک وہی حساب کا دن ہے"۔ [۳۹]

رشید امجد موت کے بعد کی زندگی کو مختلف زاویوں سے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک سوچ ہے جو ہمہ وقت اکسار ہی ہے۔ خود کلامی بھی ہے اور مرشد سے مذاکرہ بھی۔ ان کا ذہن حقیقت اور تخیل دونوں میں الجھا ہوا ہے۔ انہوں نے حیات بعد الموت کو مذہبی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں انسان نئی زندگی میں داخل ہو گا۔ لیکن اس سے پہلے حساب کا عمل ہو گا۔ اپنے اعمال پیش کئے جائیں گے۔ قبر میں جانے اور حساب کے دن کے درمیان ایک طویل انتظار ہے۔ ایک دن یہ انتظار ختم ہو جائے گا۔

مجموعی طور پر رشید امجد کی کہانیاں صحیح معنوں میں خوف زدہ زندگی کی نمائندہ ہیں۔ بے یقینی کی کیفیت نے فرد کو انفرادی و اجتماعی سطح پر کرب میں مبتلا کر دیا ہے۔ رشید امجد کے افسانوں میں سماجی و نفسیاتی خوف کو مختلف تناظرات میں دکھایا گیا ہے۔ سیاسی، معاشی، ریاستی اور مذہبی عناصر نے نہ صرف خارجی جبر اور خوف پیدا کیا بلکہ اس کے اثرات داخل پر بھی ڈالے جو ذہنی خلل کا باعث بنے۔ ان کا اسلوب اپنی انفرادیت کی خود مثال ہے۔ ان کے ہاں خارج اور داخل کی کشمکش نے انسانی وجود کو سوالیہ بنا دیا ہے۔

جدید زندگی کی ترجیحات بدل چکی ہیں۔ زمانے نے کروٹ لے لی ہے۔ سائنس نے فرد کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ بدلتے تقاضوں نے فرد کو ہراساں کر دیا ہے۔ سماجی نظام کی بگڑتی صورت حال نے خوف بڑھا دیا ہے۔ رشتوں کی دیوار گر رہی ہے۔ سہارے ختم ہو رہے ہیں۔ یہ ایسے حقائق ہیں جنہیں رشید امجد کی قلم لکھ رہی ہے۔ سماجی بے اعتدالی کا نتیجہ خوف ہے۔ ایسا خوف جس سے ہر شخص وابستہ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں "رشید امجد نے حال کے نقطے پر کھڑے ہو کر ماضی اور مستقبل دونوں سے رابطہ قائم کیا ہے"۔ [۴۰] گھر گھر میں عدم برداشت اور عدم تعاون پیدا ہو چکا ہے۔ بڑھاپا فرد کو چاٹ رہا ہے، دن بدن سنسانی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ایسے موضوعات ہیں جو فرد کے خوف میں اضافہ کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا تحقیق سے یہ واضح ہوتا

ہے کہ ان کے بعض افسانوں کے عنوانات سے جبر اور خوف واضح ہو جاتا ہے۔ رشید امجد اپنے تجربات و مشاہدات کو ایسا عنوان دیتے ہیں کہ اس میں کہانی کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔



حوالہ جات

۱۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر (پس لفظ) رشید امجد-ایک مطالعہ، از ڈاکٹر شفیق انجم، نقش نگر، راولپنڈی، ۲۰۰۹ء

۲۔ رشید امجد، ڈاکٹر، مزاحمتی ادب ایک جائزہ (مضمون)، مشمولہ: مزاحمتی ادب (۱۹۹۷ء۔۲۰۰۷ء)، مرتبہ: ڈاکٹر رشید امجد، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۶۱

۳۔ رشید امجد، دکھ ایک چڑیا ہے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۲۶

۴۔ ایضاً، ص ۲۷

۵۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۷۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۸۔ ایضاً، ص ۱۹۵

۹۔ ایضاً، ص ۱۹۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۵۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۵۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۱۳۔ انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، (پیش لفظ) دکھ ایک چڑیا ہے، از رشید امجد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۷۰

۱۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۴۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۳۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۴۱

۱۷۔ نوازش علی، ڈاکٹر، رشید امجد کے افسانوں کی اسلوبیاتی اساس (مضمون)، مشمولہ: رشید امجد منتخب افسانے، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۹

۱۸۔ رشید امجد، ڈاکٹر، دکھ ایک چڑیا ہے ص ۱۴۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۵۷

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۲۱۔ انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، پیش لفظ، دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۷

۲۲۔ رشید امجد، ڈاکٹر، دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۸۰

۲۳۔ ایضاً، ص ۸۰

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۴۷، ۲۴۸

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۴۸

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۱

۲۷۔ صفیہ عباد، ڈاکٹر، رشید امجد کا نیا افسانوی مجموعہ دکھ ایک چڑیا ہے کا مطالعہ و تجزیہ، (مضمون)، مطبوعہ: تحقیقی جرنل، شمارہ ۲، ۲۰۱۸، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ، ص ۹۷

۲۸۔ ایضاً، ص ۶۵

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۳۴

۳۰۔ شمیم حنفی، ڈاکٹر (پسِ لفظ) رشید امجد - ایک مطالعہ، از ڈاکٹر شفیق انجم، نقش گر، راولپنڈی، ۲۰۰۹ء

۳۱۔ رشید امجد، ڈاکٹر، دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۷۳، ۷۲

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۳۳۔ ایضاً، ص ۹۴

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۴۴

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۱۴

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۸۷

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۳۸۔ ایضاً، ص ۵۴

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۴۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر (پسِ لفظ) کہانی نے خواب دیکھا، از رشید امجد، صریر پبلیکیشنز، راولپنڈی، ۲۰۲۰ء

باب چہارم

ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ

رشید امجد کی لکھت کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں ہوا۔ یہ دور افسانہ نگاری میں جدت کا دور تھا۔ روایتی کلاسیکی افسانے کی جگہ علامتی اور تجریدی افسانہ متعارف ہوا۔ جسے نیا یا جدید افسانے کا نام دیا گیا۔ رشید امجد کا نام جدید افسانہ نگاروں کی صفِ اول میں لیا جاتا ہے۔ ساٹھ کی دہائی سے لے کر اب تک ان کے ۱۴ افسانوی مجموعے اور ۲ کلیات منظر عام پر آچکے ہیں۔

زیر تحقیق افسانوی مجموعہ "دکھ ایک چڑیا ہے" نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد سے ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا۔ جس میں کل ۵۱ / افسانے ہیں۔ اس سے قبل ان کا آخری مجموعہ ۲۰۰۷ء میں "عام آدمی کے خواب" کے نام سے منظر عام پر آیا۔ ۲۰۰۷ء سے لے کر 'دکھ ایک چڑیا ہے' کی اشاعت تک کا دورانیہ ان کی زندگی کے نئے تجربات اور مشاہدات کا دور ہے۔ انہوں نے سابقہ موضوعات کو سامنے رکھتے ہوئے جدید زندگی کے تناظرات کی نشاندہی کی۔ انہوں نے ہر دور کے سیاسی و سماجی نظام کی تبدیلی کو بہت قریب سے دیکھا۔ زیر تحقیق افسانوی مجموعے کی کہانیاں جدید زندگی کی نئی تصویریں ہیں۔ جو فرد کی عائلی زندگی کو نئے زاویوں میں پیش کرتی ہیں۔ جدید دور کے سیاسی و سماجی ماحول کے تغیر و تبدل نے رشید امجد کی فکری صلاحیتوں کو نیا موڑ دیا۔ فرد کی ظاہری و باطنی کیفیات کو حقیقی و نفسیاتی امتزاج کے ساتھ پیش کیا۔ ان کہانیوں کے بعض عنوانات سے کہانی میں جبر و خوف کی صورتحال کی جھلک نظر آتی ہے۔ رشید امجد اپنے تجربات اور مشاہدات کو مخصوص عنوانات میں سامنے لاتے ہیں۔ زیر تحقیق مقالے میں رشید امجد کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے جبر اور خوف کے سماجی و نفسیاتی تناظرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سب سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ جبر اور خوف کی معنویت کیا ہے؟۔ ان دو اصطلاحات کو سماجی و نفسیاتی علوم کی بابت سمجھا گیا۔ جبر یا جبریت پر بحث قدیمی ہے۔ سائنس، فلسفہ اور مذہبی علوم میں جبر کی توضیحات الگ الگ ہیں لیکن بنیادی تصور ایک ہے۔ جبریت اس نظریہ یا تصور کا نام ہے جس میں تمام واقعات یا اعمال ان اسباب کا نتیجہ ہیں جن میں فرد کا ارادہ شامل نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے کوئی اور قوت کارفرما ہوتی ہے۔ جیسا کہ تقدیر، جبلت، فطرت وغیرہ۔ فرد مجبور

محض ہے ۔ فرد اپنے فیصلے مرضی سے نہیں کر سکتا۔ جبریت کو اختیاریت کی ضد کہا جاتا ہے ، کیونکہ اس صورتحال میں فرد بے اختیار ہوتا ہے۔ فرد ابتدائی زندگی سے لے کر جدید زندگی تک جبریت کا شکار رہا ہے، اسباب و تناظرات بدلتے رہے ہیں۔ ابتدائی دور کا انسان فطری جبریت سے دوچار رہا۔ جس میں بارش، طوفان، بجلی کی گرج چمک کے ڈر اور خوف نے انسان کو غاروں میں چھپنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد انسان کا زرعی دور شروع ہوا۔ اس ارتقائی عمل میں ضروریات زندگی نے انسان کو سماجی ڈھانچہ تشکیل دینے پر مجبور کیا۔ یہ ایک نئے جبر کی ابتداء تھی جب انسان نے معاشرتی نظام کی بہتری کے لئے اصول وضوابط بنائے۔ جس کے نتیجے میں قبائلی اور پھر ریاستی نظام کا قیام عمل میں آیا۔ حدود و قیود کا سلسلہ شروع ہوتا گیا۔ سزا جزا کا نظام متعارف ہوا۔ یہ تمام ارتقائی مراحل جبریت کے اسباب بنے۔ جدید زندگی میں فرد کی ترجیحات بدل گئیں اور فرد کا سماجی نظام ٹوٹ پھوٹ گیا۔ جس کی بنیادی وجوہات میں سیاسی عدم استحکام، سماجی بے راہ روی، عدم مساوات اور معاشی بدحالی ہیں۔ جدید زندگی میں میکانکی ترقی جدید جبری تناظرات کی پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ فرد کی جگہ مشین نے لے لی۔ طرز زندگی کی نئی کروٹ نے فرد کو میکانکی بنا دیا۔ مندرجہ بالا تمام جبری تناظرات کا اثر فرد کے اعصاب پر ہونا شروع ہوا تو نفسیات کا علم سامنے آیا۔ تقریباً دو صدی قبل نفسیاتی علم کی ابتداء ہوئی۔ علم نفسیات میں فرائڈ کو بابائے نفسیات کا درجہ دیا جاتا ہے۔ فرائڈ کا بڑا کارنامہ لاشعور کی دریافت ہے۔ اس نے خارج کو مد نظر رکھتے ہوئے فرد کے داخل میں جھانکا تو ایک نئی دنیا سامنے آئی۔ فرائڈ کا نظریہ "تحلیلِ نفسی" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کے بعد علم نفسیات میں گوناگوں اضافہ ہوتا گیا۔ ژونگ نے اجتماعی لاشعور کا نظریہ پیش کیا اور فرد کے نفسیاتی عمل میں ماحول، وراثت اور روایات کو بھی شامل کیا۔ اس کے بعد علم نفسیات کی اہمیت بڑھ گئی۔ خارج اور داخل کا تصادم ذہنی خلل کا باعث بنا۔ اس میں فرد کی بے بسی اور بے کسی کو منظر عام پر لایا گیا۔

مندرجہ بالا تناظرات کے باعث فرد بے یقینی اور عدم تحفظ سے دوچار ہوا۔ جس سے خوف نے جنم لیا۔ زیر تحقیق مقالے میں خوف کی سماجی و نفسیاتی معنویت پر تفصیلاً روشنی ڈالی گئی۔ اصطلاحی معنوں میں خوف ایسی کیفیت یا صورتحال ہے جو کسی خطرے کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ اس میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ خوف بھی انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ ہے۔ ابتدا میں انسان فطری عوامل کی بدولت خوفزدہ ہوا کرتا تھا۔ ان عوامل کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ انسان نے جب ایک دوسرے کے خلاف حدود و قیود بنانا شروع کیں تو

اپنے تحفظ کے اقدامات بھی کئے۔ ہتھیاروں کی ایجادات خوف کے تناظر میں ہوئیں۔ ہر عہد میں جدید سے جدید تر ہتھیار تیار ہوتے رہے۔ موجودہ دور میں اس کی جدید ترین شکل ایٹم بم ہے۔ جو عالمی طاقتوں کے فروغ کا باعث ہے اور طاقت کا یہ فروغ لازمی صورت میں جبر کا فروغ ہے۔ بہر حال انسان انسان کا ازل سے دشمن رہاہے اور اس بنا پر خوف کی کیفیت بھی تحرک پذیر رہی۔ خارج کا خوف داخل پر بہت جلد وارد ہوتا ہے۔ انسان کی قوت ارادی ماند پڑ جاتی ہے جس کا نتیجہ ذہنی خلل کی صورت میں نکلتا ہے۔ خوف فرد کے اعصاب کو شل کر دیتا ہے۔ جس سے شعور اور لاشعور کے درمیان شدت پیدا ہوتی ہے۔ یہ شدت جبر اور خوف کو ہوا دیتی ہے جبکہ اس سے پیدا ہونے والی تنہائی، افسردگی اور بیگانگی انسان کے سماجی اور نفسیاتی سطح پر بگاڑ کا باعث بنتی ہے۔

ہر ادیب اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے۔ جو سماجی سطح پر زندگی سے جڑے تمام امور کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ رشید امجد بھی معاصر زندگی کے نباض افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے علامت، تجرید، تمثیل اور تشبیہ کو استعمال کرتے ہوئے سماجی و نفسیاتی جبر و خوف کے عوامل کی نشاندہی کی ہے۔ "دکھ ایک چڑیا ہے" رشید امجد کی تجرباتی زندگی کا عکاس مجموعہ ہے۔ انہوں نے جدید زندگی کی کربناکی کو اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا۔ ان کے سابقہ مجموعوں کو اگر پسِ منظری مطالعہ کے طور دیکھا جائے تو اِن کہانیوں میں موضوعات کی بجائے تناظرات میں تنوع ملتا ہے۔ ملکی و غیر ملکی بدلتا منظر نامہ، نئے مناظر دکھاتا ہے۔ اس مقالے کے دوسرے باب میں ان کہانیوں کو تجزیاتی عمل سے گزارا گیا ہے جس میں جبر کی سماجی و نفسیاتی جہات کا از سرِ نو تجزیہ کیا گیا ہے اور اس تجزیے کی روشنی میں جبر کی ان جہتوں کو نمایاں کیا گیا ہے جن کا تعلق انسان اور اس سے متعلقہ علمیات سے ہے۔ یہ کہانیاں رشید امجد کی فکری و فنی بصیرت کا بعینہ نمونہ ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی میں بنیادی مسئلہ فلسفہ حیات و ممات ہے۔ زندگی اور موت ایک دوسرے سے منسلک اور باہم لازم و ملزوم ہیں۔ منسلک اور لازم و ملزوم کی یہ جہت جبریت کو تقویت دیتی ہے۔ جس سے تشدد، تشدد سے انتشار، انتشار سے بگاڑ، بگاڑ سے ہیجان، ہیجان سے بیگانگی و تنہائی، تنہائی سے خوف اور خوف سے نفسیاتی کشمکش اور نفسیاتی کشمکش کا انفرادی سطح سے پھیل کر اجتماعی سطح پر اپنا تاثر قائم کرنا، جیسے عوامل سماج میں دہشت و بربریت کو فروغ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کے افسانوں میں یہ تمام جہات کرداروں اور کہانیوں کی شکل میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے فرد کی زندگی کو تین حصوں میں دکھایا ہے۔ ایک انسان پیدائش سے پہلے کہاں تھا، دوسرا انسان پیدا تو ہو گیا لیکن اس کی مرضی

اس میں شامل نہیں، تیسر امرنے کے بعد انسان کی حیثیت کیا ہو گی۔ گویا ان کے ہاں حیات کے جبر سے لے کر موت کے جبر تک انسان کا عروج و زوال دکھایا گیا ہے۔ یہاں ان کے افسانے "تمنا بے تاب" اور "سبزہ زہر اب" عمدہ مثالیں ہیں۔ جبکہ "رائیگاں کی دھول" علامتی پیرائے میں لکھا گیا افسانہ ہے جس میں فرد کی خود مختاری اور بے اختیاریت کے مابین کشمکش دکھائی گئی ہے جو کہ ان دو کے مابین ٹینشن (بمعنی جبریت) کو اجاگر کرتی ہے۔ رشید امجد علامتی انداز میں زندگی کے تسلسل کو دکھاتے ہیں۔ پیدائش سے آخری عمر تک حیاتیاتی مدارج کو بہت عمدگی سے بیان کرتے ہیں۔ رشید امجد نے مارشل لا اور جمہوری حکومتوں کے ادوار کو بہت قریب سے دیکھا۔ اس مجموعے میں ۲۰۰۷ء اور مابعد سیاسی رجحانات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مشرف کے مارشل لا اور بعد کی نام نہاد جمہوری حکومتوں میں ریاستی اداروں کی کرپشن میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اس کرپشن کا تانا بانا سیاست دانوں سے جاملتا ہے۔ جن کا کام مال و دولت اکٹھا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں۔ "حسرت چشیدہ" میں کرپٹ نظام کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جس نے عام آدمی کے گھر کا سکون برباد کر دیا ہے۔ ایسے ماحول میں ایماندار آدمی کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ رشید امجد سماجی گندگی کو گٹر کا درجہ دیتے ہیں۔ گٹر کی علامت ان کے ہاں اکثر استعمال ہوتی ہے۔ "افسوس حاصل کا" شہر کی تمام گندگی کو ایک جگہ جمع کرتی کہانی ہے۔ گٹر گندگی کی آماجگاہ ہوتی ہے۔ یہ سیاسی و ریاستی تناظر میں ناانصافی، عدم مساوات، ظلم و تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان کی نشاندہی کرتی کہانی ہے۔ رشید امجد عام آدمی کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے عام آدمی کی حالت زار کو اپنی کہانیوں میں دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ رشید امجد کا خاصہ ہے کہ وہ مظلوم طبقے کی آواز بنتے ہیں، یہی تڑپ انہیں ملکی حدود سے باہر لے جاتی ہے۔ پردیس میں رہنے والے جس جبریت کا شکار ہیں، اسے ان کے افسانہ "موسم بہار میں سوکھی ٹہنیاں" میں دکھایا گیا ہے۔ سامراجی قوانین کی زد میں غریب طبقہ پس رہا ہے جبکہ امیروں کی جان بخشی کے کئی راستے نکل آتے ہیں۔ زندگی اس حد تک جبر و خوف میں مبتلا ہے کہ فرد اپنی اولاد کو سر عام اولاد کہنے سے قاصر ہے۔

معاشی عدم استحکام نے ہمیشہ سے فرد کو مفلوج کئے رکھا ہے۔ معاصر زندگی میں بھی حصول معاش کا مسئلہ جوں کا توں ہے۔ لیکن اس کے تناظرات بدل گئے ہیں۔ پہلے لوگ دیہات سے شہروں میں جانے کو ترجیح دیتے تھے اب دورِ حاضر میں بیرون ملک جانے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اس کے نتائج کربناک ہیں۔ اس صورت حال کی عمدہ مثال رشید امجد کا افسانہ "شام کہانی" ہے۔ یہ کہانی سماج کے اس جبری پہلو کو

سامنے لاتی ہے جس میں والدین اپنی اولاد کو کھو رہے ہیں۔ جدید دور کا یہ المیہ ہے کہ والدین کرب اور بے سہارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ بوڑھی ہڈیاں اولاد سے دوری کا غم اٹھانے کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتیں۔ معاشی بے راہ روی نے خاندان کو بانٹ دیا ہے۔ "مٹی کی مہک" والدین کی جبری زندگی کی نمائندہ کہانی ہے۔ جدید دور میں میکانکی ترقی نے فرد کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ رشید امجد کے اس افسانوی مجموعے میں مشینی پیش رفت کو بہ طور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ اس طرز کے افسانے انہیں مابعد جدید عہد کی نمائندگی پر زور دیتے ہیں۔ اور یہ نمائندگی انہیں اپنی سابقہ کہانیوں کی نسبت انفرادیت کا درجہ دیتی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ کہانیاں جدید اور مابعد جدید عہد کے امتزاج کی عکاسی کرتی ہیں یعنی انڈسٹریلائزیشن (صنعت کاری) سے گلوبلائزیشن (عالمگیریت) تک محیط ہیں۔ جدید دور میں جن مشینوں کو انسان کی فلاح اور ضروریات پوری کرنے کے لیے ایجاد کیا گیا وہیں ان مشینوں نے انسان کی جگہ لے کر اسے بے دخل کر دیا۔ پہلے انسان کو اہم سمجھتے ہوئے اس کی ضرورتیں پوری کی جاتی تھیں اب انسان کے مقابلے میں اشیاء کو اہمیت دے کر انسان کی ضرورتیں پیدا کی جاتی ہیں۔ گویا اس عہد میں انسان کی بجائے شے کو فوقیت دی گئی ہے جو ایک طرح کا میکانکی جبر ہے۔ اس فوقیت اور عدم فوقیت کے مسئلے کو ڈاکٹر رشید امجد نے اپنے افسانوں میں مختلف کرداروں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ فرد کی زندگی میں کمپیوٹر اور اس سے وابستہ مشینی آلات جیسے موبائل وغیرہ کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ عمومی تناظر میں یہ ترقی کا دوسرا نام ہے لیکن رشید امجد کی نگاہ کچھ اور دیکھتی ہے۔ کمپیوٹر اور موبائل نے ویڈیو کالنگ کے ذریعے چہروں کو بہت قریب کر دیا ہے۔ دن رات کسی بھی وقت سکرین پر ایک دوسرے کو دیکھا جا سکتا ہے لیکن دلوں کے فاصلے بڑھ گئے ہیں۔ ہمارے سماج میں ایک عام رویہ فروغ پا رہا ہے کہ موبائل سے بات کر کے دوریاں کم ہو گئیں ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس طرح اپنوں سے ملنے کی تڑپ ختم ہو گئی ہے۔ اس مشینی نظام نے چہروں کو قریب کر کے دلوں میں خلا اور فاصلہ بھر دیا ہے جس نے جبر کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہی جبری تناظر ان کے افسانہ 'گماں کے رشتے' میں اجاگر کیا گیا ہے۔

سماج میں جبریت کا ایک تناظر مذہب ہے۔ ۹/۱۱ کے واقعہ نے مذہب بالخصوص اسلام پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اسلام کو دہشت گرد مذہب قرار دینے کے لئے امریکہ و دیگر غیر مسلم ممالک پیش پیش رہے۔ افغانستان اور اس سے ملحقہ حدود کو دہشت گرد پناہ گاہ کا درجہ دیا گیا۔ اس سلسلے میں ڈرون حملوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ جس کا رد عمل انتہائی سنگین رہا۔ غیر ملکی طاقتوں نے معاصر حکومتوں کے ساتھ

مل کر دہشت گردی کے خاتمہ کے لئے آپریشن کئے۔ یہ ایسا المیہ تھا جس میں مذہبی کارڈ کھل کر استعمال ہوا۔ خود کش دھماکوں کا ملک میں سلسلہ شروع ہوا۔ "شہر گریہ" اس تناظر میں لکھی گئی عمدہ کہانی ہے۔ جس میں دہشت گرد کو پہچاننا اس لئے ممکن نہیں تھا کہ اس نے داڑھی رکھی ہوئی تھی اور وہ جنت کی بشارت دے رہا تھا۔ وہ ہائپر ریئلٹی کا حامل کردار تھا۔ جسے عام آدمی ایسے سماج میں پہچاننے سے بے بس ہے مذہبی لبادہ اوڑھ کر اپنے مقاصد پورے کرنا اس عہد کا ایک خاصہ بن چکا ہے جسے رشید امجد نے نمایاں کیا ہے۔ مذہب کے ساتھ ثقافتی پہلو بھی رشید امجد کی کہانیوں کا موضوع بنتا ہے۔ فرد ثقافتی اقدار کا پابند ہوتا ہے۔ جدید دور میں منظر نامہ تبدیل ہو رہا ہے۔ خاندان کی ٹوٹ پھوٹ نے فرد کی زندگی کو بکھیر دیا ہے۔ ایسی اقدار جو فرد کے لئے باعث راحت تھیں، اب انسان ان سے بیزار ہوتا جارہا ہے۔ لباس، رہائش اور خوراک میں خاطر خواہ تبدیلی آچکی ہے۔ پرانے لوگ نئی طرز زندگی کو اپنانے پر مجبور ہیں۔ رشید امجد ایسی صورتحال کو 'تصویریں اور دیواریں" اور "مسکراتے لمحے میں نکلتی افسردہ کہانی" جیسے افسانوں میں بیان کرتے ہیں۔

رشید امجد کی کہانیاں فرد کی داخلی صورت کا پرتو ہیں۔ ان کہانیوں میں جبریت کے نفسیاتی تناظرات کو سامنے لایا گیا ہے۔ فرائڈ اور ژونگ کے نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے جبلت، شعور اور لاشعور کے تحت جبری صورتحال کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جبلتیں اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے فرد کو نفسیاتی طور پر اکساتی رہتی ہیں۔ یہ ایسی قوت بنتی ہیں جو فرد کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ رشید امجد کے کرداروں پر جبلتیں حاوی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ جبلتیں وراثت، ماحول، نسل اور روایات سے منتقل ہوتی ہیں۔ رشید امجد کا افسانہ "روایت" جبلت کی جبریت کو منظر عام پر لاتا ہے۔ جنسی جبلت ہر فرد میں پائی جاتی ہے۔ فرد کی ایگو اور سپر ایگو اس کو کنٹرول کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ایک وقت آتا ہے جب جنسی جبلت فرد کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ جس کا نتیجہ غیر اخلاقی بھی نکلتا ہے۔ "ڈائری کا نیا صفحہ" جنسی جبلت کی کہانی ہے جس میں فرد سماجی حدود وقیود سے بے نیاز ہو کر جنسی تسکین حاصل کرتا ہے۔ رشید امجد کے افسانوں میں شعور اور لاشعور کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ ہوش وحواس میں گم کائنات میں کبھی وہ اپنوں میں بیٹھا ہوتا ہے اور اگلے ہی لمحے کہیں اور پہنچ جاتا ہے۔ کبھی حاضر، کبھی غائب، موجود اور ناموجود، خواب، واہمے فرد کو کسی اور سمت لے جاتے ہیں۔ بعض اوقات یہ وجودی موضوعات کا روپ دھار لیتے ہیں۔ رشید امجد "خبطی" میں شعوری قوتوں کی نشاندہی کرتے ہیں جبکہ رشید امجد کی کہانی 'طوطے کی موت' فرد کے لاشعوری انتشار کی عمدہ مثال ہے۔ جہاں فرد کا وجود

لاشعوری طور پر کہیں اور ہوتا ہے۔ شدید ذہنی دباؤ اور بے بسی اس کے لاشعور میں گھر کر جاتی ہے۔ لاشعور اگر فرد کو اپنی گرفت میں لے لے تو اس کے افعال میں بدلاؤ آ جاتا ہے۔ 'اضطراب شام تنہائی' میں مرکزی کردار ہر کام اپنے منشا کے الٹ کر رہا ہوتا ہے۔ عجیب بے بسی اور مخمصے کی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے۔ ان کہانیوں میں بگاڑ شدہ معاشرے کا انتشار بھی ہے اور نفسیاتی الجھن بھی۔ شعور اور لاشعور کی کشمکش سے بھرپور یہ کہانیاں کئی روپ دھار لیتی ہیں۔ جن سے معنوی سطح پر تکثیرِ معنی اور کثرتِ قصہ کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔

زیر تحقیق مقالے کے دوسرے باب میں جبر کے علاوہ خوف کے سماجی و نفسیاتی تناظرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ معاشرے کا بدلتا رنگ رشید امجد کی حساس طبعیت کو کرب، درد اور خوف میں مبتلا کرتا رہا ہے۔ فرد کی پوری عمر سماج میں نیک نامی اور اپنا مقام بنانے میں لگ جاتی ہے۔ لوگوں کی نظروں میں اچھا رہنے کی تمنا سب کی ہوتی ہے۔ ہمارے سماج میں بنیادی خوف بدنامی کا ہے۔ یہ خوف ہر شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ فرد کے ساتھ ہے۔ "صحرا کہیں جسے" اسی نوعیت کی کہانی ہے۔ جس میں فرد کا معاشرے میں مقام اس کے سامنے دیوار بن جاتا ہے۔ فرد لوگوں کی نظروں کا تماشا بننے سے خائف ہے۔ اسی لئے وہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاتا جس سے اس کی اور اس سے وابستہ خاندان کی تذلیل ہو۔ اس افسانے میں دہرا رویہ سامنے آتا ہے ایک تو اس جبر کا جو کردار کی شخصیت پر مشتمل ہے۔ اس کی شخصیت ہی اسے معاشرے میں معزز رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور شخصیت کی بدنامی کا خوف اور شخصیت کا جبر دونوں اس کی نفسیاتی کشمکش میں بیک وقت اضافہ کر رہے ہوتے ہیں۔ جبر اور خوف کا یہ امتزاج رشید امجد کے کئی افسانوں میں نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں سے بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے جیسے جبر اور خوف دونوں لازم و ملزوم ہوں۔

ہر سماج کا ایک دائرہ ہوتا ہے۔ فرد کی زندگی اس دائرے کے اندر گھومتی ہے، اس سے نکلنا کئی مسائل سے دوچار کرتا ہے۔ رشید امجد فرد کے باغیانہ رویوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خوف کو "عشق کا موسم" میں دکھاتے ہے۔ سماج میں غیرت کے نام پر قتل اسی خوف کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ مرنے والوں پر بغاوت کے الزام اور مارنے والوں کی غیرت کے امتحان کا خوف اس کہانی کا بنیادی موضوع بنتے ہیں۔ معاشرتی بیماریوں میں ایک مادیت پرستی ہے۔ جس نے انسان کو مشین بنا دیا ہے۔ اور وہ خودکار طریقے سے اپنے اعمال و افعال ادا کر رہا ہوتا ہے جبکہ اس کی باگ دوڑ مشینوں کو بیچنے والے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ معاشی خوف اس سرمایہ دار سے چھٹکارا حاصل نہیں کرنے دیتا۔ اسی خوف نے اچھے برے کا امتیاز بھی مٹا دیا ہے اور

یوں حلال و حرام کی تمیز بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس مفلوج زدہ ماحول میں رشید امجد کا ضمیر ملامت کرتا ہے۔ دنیا و آخرت میں سزا اور رسوائی کا خدشہ اسے جھنجھوڑتا ہے۔ لیکن وہ سماج میں ہونے والی ان تبدیلیوں کو روک نہیں سکتا اور بالآخر ان تبدیلیوں کو قبول کرتے ہوئے خود بھی ان کا حصہ بن جاتا ہے۔ معاشی و سماجی جبر و خوف اسے ہمیشہ نڈھال اور لاچار رکھتا ہے۔ معاصر زندگی میں روشن خیالی کا رجحان غالب ہو رہا ہے۔ دفتری زندگی سے مرد و عورت کے ناجائز تعلقات بڑھ رہے ہیں۔ ان تعلقات کے نتیجے میں گھریلو ناچاقیاں بڑھ رہی ہیں اور میاں بیوی کا رشتہ عدم اعتماد کا شکار ہو رہا ہے۔ "لذت کا خوف" اسی تناظر میں معاشرتی رویوں کی تصویر ہے۔ ناجائز تعلقات کا بھانڈہ پھٹ جانے کا خوف سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ یہ کہانی اخلاقی پستی کی عمدہ مثال ہے۔

جرائم کے دن بدن اضافے نے معاشرتی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ آئے روز ڈکیتی، چوری، اغوا اور دیگر جرائم نے خوف و ہراس کو بڑھا دیا ہے۔ فرد کے جان و مال محفوظ نہیں ہیں۔ محافظ گم ہیں۔ "دکھ ایک چڑیا ہے" معاشرے کے ان عناصر سے نقاب ہٹاتی کہانی ہے جن کی وجہ عام آدمی دہشت و خوف میں گھرا ہوا ہے۔ اس کہانی میں ایسے چہروں کی نشاندہی کی گئی ہے جنہوں نے سماج میں نیک نامی کے تاج سجائے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ جرائم کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ عدم تحفظ کا خوف بے اطمینانی کا باعث بنتا ہے۔ رشید امجد اپنی فنی مہارت کے ذریعے قاری کو اپنے ساتھ پیوست رکھتے ہیں اور بھاگنے نہیں دیتے۔ نئی نسل کی ترجیحات نے رشتوں میں فاصلے بڑھا دیے ہیں۔ اولاد اپنے مستقبل اور کیریئر کے لئے بیرون ملک جا رہی ہے۔ والدین کے منع کرنے کے باوجود بھی ایسا ہو رہا ہے۔ بچے اپنے بوڑھے والدین کو نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ جاتے ہیں۔ والدین کربناکی اور محرومی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ جدید دور میں والدین کا بچوں سے دوری کا خوف بڑھ رہا ہے۔ "مٹی کی مہک" اور کچھوے کی موت" میں رشید امجد نے جغرافیائی خوف کے تناظرات کا احاطہ کیا ہے۔ وطن کی محبت اسے بیرون ملک بے چین رکھتی ہے۔ آبائی وطن سے دوری کا خوف رشید امجد کی ذاتی زندگی کا مشاہدہ ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بیرون ملک کی فلیٹ زدہ زندگی میں خود کو قید تصور کرتا ہے۔ وہ واپس اپنے ملک آنا چاہتا ہے لیکن اولاد کی مجبوری آڑے آجاتی ہے۔ زندگی لمحہ لمحہ انجانے جبر و خوف میں بسر ہوتی رہتی ہے۔ جبر و خوف کی یہ صورتحال عام طور پر اخلاقی پستی کا نتیجہ ہے۔

اخلاقی پستی نے اقدار کی شناختوں کا بحران پیدا کر دیا ہے۔ ایک چیز کا بحران کسی دوسری شے کا امکان پیدا کرتا ہے۔ شناخت کے بحران نے عدم شناخت کا امکان پیدا کر دیا ہے۔ یہی نکتہ رشید امجد کے افسانوں میں

موضوعِ بحث رہا ہے۔ جس نے انسان کو مجبور تو کیا ہی ہے لیکن اس کے اثرات نفسیاتی سطح پر خوف اور ڈر کی صورت میں سامنے آئے ہیں۔ سماج میں ہیجان اور بگاڑ اس کی عمدہ مثال ہے۔ رشید امجد اپنی کہانیوں میں شناخت اور عدم شناخت کے پہلوؤں کو فراموش نہیں کرتے۔ معاصر دور میں فرد کی شناخت گم ہو رہی ہے۔ وہ ان حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں جن کے پیچھے زندگی کا خوف چھپا ہوا ہے۔ انسان اپنی فیملی کے بہتر مستقبل اور پہچان کے لئے پوری عمر تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ حتی کہ اپنی اولاد اور بیوی بھی اسے وہ اہمیت نہیں دیتے جو پہلے دی جاتی تھی۔ یہ گھر گھر کی کہانی ہے جب والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں اور ان کا جسم کسی کام کا نہیں رہتا تو ان کی اہمیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ کھانے کی ٹیبل پر بھی اس کی حیثیت واجبی سے ہو گئی ہے۔ " فالتو آدمی " میں شناخت کی گمشدگی کا خوف بیان کیا گیا ہے۔ یہ سماجی رویوں کی تبدیلی کے باعث پیدا ہونے والے خوف کی کہانی ہے۔ شناخت کی گمشدگی کو رشید امجد دوسرے پہلو سے بھی دیکھتے ہیں۔ جس میں موجود اور ناموجود کی تفاہیم کو سائنس اور فلسفہ دونوں میں تلاش کرتے ہیں۔ فرد کا اصل کیا ہے؟ جسم اصل ہے یا روح؟ رشید امجد کا ذہن شکوک و شبہات میں بٹ چکا ہے۔ جسم اور روح کی کشتیوں میں سوار گرنے کے خوف میں مبتلا ہے۔

" دکھ ایک چڑیا ہے " مجموعہ جس دور میں لکھا گیا۔ اس وقت دہشت گردی اپنے عروج پر تھی۔ پورے ملک میں دھماکے، خود کش حملے، ٹارگٹ کلنگ میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ رشید امجد " ہنوز خواب میں " دھماکوں کے بعد شہر کی سنسانی اور ویرانی کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ دہشت گردی کی وجہ بدامنی اور عدم تحفظ کی فضا پیدا ہوئی۔ ہر وقت یہی خوف طاری رہتا کہ دھماکہ نہ ہو جائے۔ کوئی جگہ محفوظ نہیں تھی۔ مساجد، سکول، اڈے، بازار، پارک کسی بھی جگہ دھماکہ ہو سکتا تھا۔ گھر سے نکلتے وقت واپس نہ آنے کا خوف رہتا۔ بچے سکول سے واپس گھر پہنچ جاتے تو ماؤں کے دم میں دم آتا۔ رشید امجد نے اپنی کہانیوں میں ریاستی اداروں کی کمزوری کی بھی نشاندہی کی ہے جو دہشت گردی کو کنٹرول کرنے سے قاصر رہے۔ ": اپنی اپنی بلی " خوفزدہ زندگی کی عکاس کہانی ہے۔ اس میں بیرون ملک پاکستانیوں کی نئی نسل دہشت زدہ ماحول سے خوفزدہ ہے اور اپنے ملک آنے کو تیار نہیں۔ جس سے حب الوطنی کا جذبہ کمزور ہونے کا خدشہ پیدا ہو گیا ہے۔ " شہر گریہ " میں گلی گلی، شہر شہر ویرانی، دہشت اور سناٹے کی منظر کشی کی گئی ہے۔ جس کو دیکھ کر فرد خوف میں مبتلا ہے۔

زیر تحقیق کہانیوں میں خوف کے عناصر کے نفسیاتی تناظرات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ ہر کہانی نفسیاتی نہیں ہوتی لیکن رشید امجد کی بیشتر کہانیوں میں نفسیاتی کشمکش پائی جاتی ہے۔ فرد کے ذہنی انتشار کے پیچھے نفسیاتی عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ جو لاشعور سے شعور میں ابھرتے ہیں۔ رشید امجد کی ذاتی زندگی بھی تجربات گاہ رہی اور ان کے لاشعور کو دبوچے رکھا۔ موت کا خوف ان کا اہم موضوع رہا ہے۔ ان کی اکثر کہانیاں موت سے شروع ہو کر موت پر ختم ہوتی ہیں۔ انسان جوانی کی عمر تک زندگی کی گہما گہمی میں مصروف رہتا ہے۔ لیکن آخری عمر میں اس پر موت کا خوف سوار ہو جاتا ہے۔ فرد زندگی میں اپنوں کو مرتے اور دفناتے دیکھتا آیا ہے، یہ واقعات لاشعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جب فرد بڑھاپے میں پہنچتا ہے تو یہ واقعات لاشعوری طور پر موت کے خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ خوف ذہنی خلل کا باعث بنتا ہے اور فرد خود کو دنیا سے دور کر لیتا ہے۔ رشید امجد کا تصور موت صرف وجود سے متعلقہ نہیں بلکہ ان عصری رجحانات سے بھی ہے جو سابقہ رجحانات کو ختم کر چکے ہیں۔ مشین نے انسان کو سہولیات تو دی لیکن اس کے بر عکس روایات، تہذیب، رسوم رواج کی موت واقع ہو رہی ہے۔ نیا سفر شروع ہو چکا ہے جس میں انجانا خوف موجود ہے، جو بیگانگی اور لایعنیت کی صورت میں ہمارے ارد گرد پھیلا ہوا ہے اور مسلسل کثیف ہو تا جارہا ہے۔

جدید دور کے بدلتے رجحانات نہ صرف فرد کی سماجی زندگی کو متاثر کر رہے ہیں بلکہ نفسیاتی طور پر زیادہ اثر انداز ہو رہے ہیں۔ فرد جس نے اپنی پوری زندگی ایک مخصوص طرز میں گزاری دی ہو وہ بدلتے نظام کا بوجھ کیسے اٹھائے گا۔ میکانکی دور نے انسان کو انسان سے جدا کر دیا ہے۔ رشتوں میں دراڑیں پیدا ہو چکی ہیں۔ فرد تنہائی میں مبتلا ہے۔ بظاہر وہ اس دنیا میں موجود ہے لیکن اندر سے اکیلا ہے۔ "جاتی رت کے خواب" اور تصویریں اور دیواریں" ایسی کہانیاں جس میں تنہائی انسان کو دیمک کی طرح کھائے جارہی ہے۔ گھر قید خانے کا نقشہ دینے لگا ہے۔ یہ سب فرد کے نفسیاتی مسائل ہیں۔ جو سماجی و نفسیاتی جبریت کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ذہنی نا آسودگی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ لمحہ لمحہ اذیت ناک بن گیا ہے۔ انسان اپنوں کی قربت میں حساس رہا ہے۔ جدید دور میں گھر کا ہر فرد اپنی اپنی سمت میں رواں دواں ہے۔ اس ماحول میں والدین شدید کرب میں زندگی گزار رہے ہیں۔ والدین آخری عمر میں توجہ کے محتاج ہوتے ہیں۔ بچوں کی مصروفیات نے رشتوں میں فاصلے پیدا کر دیے ہیں۔ یہ فاصلے نفسیاتی طور پر تنہائی کے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ "اپنی اپنی بلی" اس ضمن میں عمدہ مثال ہے۔

رشید امجد کی یہ کہانیاں دیگر موضوعات کے ساتھ فلسفہِ مابعد الطبعیات کو بھی اپنا موضوع بناتی ہیں۔ وہ طبعیاتی اور مابعد الطبیعاتی زندگی کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مجموعے کی کہانیوں کا خاصا یہ ہے کہ سائنسی ترقی نے رشید امجد کی علمی بصیرت کو نئی کروٹ دی ہے۔ انہوں نے سائنس اور مذہب کو ایک ساتھ اپنی کہانیوں میں دکھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی ایک نتیجہ تک نہیں پہنچ پاتے۔ سائنس اور مذہب دو مختلف سمتوں کے نام ہیں۔ سائنس تجربات پر بحث کرتی ہے اور مذہب عقائد پر۔ اس کشمکش نے رشید امجد کے کرداروں کو ذہنی دباؤ میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ بار بار مستقبل کی زندگی کا سوال دہراتے ہیں۔ یہ ان کے ہاں خوف کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ آگے کیا ہو گا، کیا ہونے والا ہے؟ وہ کیا، کیوں کب اور کیسے کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اس ضمن میں "لمحہ ناموجود میں موجود" اور خواب میں خواب" عمدہ مثالیں ہیں۔

ب۔ تحقیقی نتائج

میری اس تحقیق کے نتائج درج ذیل ہیں۔

ا۔ رشید امجد کے افسانوں میں جبر کی مختلف صورتوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ سماجی اور نفسیاتی سطحوں پر یہ صورتیں کبھی کہانی، کبھی کرداروں اور کبھی صورتحال کے روپ میں سامنے لائی گئی ہیں۔ رشید امجد نے اس مسئلے کو بہ تکرار لکھا ہے اس حوالے سے ان کے افسانے "حسرت چشیدہ"، "رائیگاں کی دھول"، "موسم بہار میں سوکھی ٹہنیاں"، "شام کہانی"، "گماں کے رشتے"، "شہر گریہ"، "مسکراتے لمحے سے نکلتی ایک افسردہ کہانی"، "دکھ ایک چڑیا ہے"، "روایت"، "طوطے کی موت" وغیرہ خاص طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔

۲۔ خوف کے سماجی اور نفسیاتی محرکات اور اثرات بھی رشید کا محبوب موضوع ہے۔ ان کے کئی افسانوں کا مرکزی کردار ایک خوف زدہ کردار ہے۔

۳۔ کتاب "دکھ ایک چڑیا ہے" میں شامل افسانے رشید امجد کے قبل ازیں افسانوں سے اس سطح پر مختلف ہیں کہ ان میں جدید دور کے مسائل خاص طور پر میکانکی زندگی، سائنسی انکشافات اور معاصر سماجی صورتحال یعنی دہشت گردی اور فرقہ واریت وغیرہ کا تناظر پہلے کے افسانوں کی نسبت مختلف ہے۔

ج۔ سفارشات

ا۔ رشید امجد کے دیگر افسانوی مجموعوں میں جبر اور خوف کے موضوع پر کام کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ نفسیاتی تناظر میں رشید امجد کی شخصیت خاص طور پر ان کی خود نوشت کے حوالے سے ان کے افسانوں میں جبر اور خوف کے موضوع پر بھی تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔

۳۔ رشید امجد کے افسانوی ڈکشن، مکالموں اور خود کلامی کے حوالے سے تحقیقی کام کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

کتابیات

i. بنیادی مآخذ

۱۔رشید امجد، دکھ ایک چڑیا ہے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد راولپنڈی، ۲۰۱۶ء

ii. ثانوی مآخذ

۱۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتب)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم ۲۰۱۸

۲۔اشفاق احمد، محمد اکرام چغتائی (مرتبین)، فرہنگ اصطلاحات۔ جلد اول، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۴ء

۳۔اقبال آفاقی، ڈاکٹر، اردو افسانہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء

۴۔انعام الحق، ڈاکٹر، نظریہ خیر، سرسید اکیڈمی، لاہور، س ن

۵۔انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء

۶۔ایم اے فاروقی (مرتب)، افسانے کے مباحث، بک ٹائم، لاہور، ۲۰۱۷ء

۷۔پاولو فریرے، مظلوموں کی ترقی، مترجمہ ارشاد احمد مغل، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۴ء

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، ادارہ فروغ زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء

۹۔رشید امجد، تمنا بے تاب، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

۱۰۔رشید امجد، ڈاکٹر (مرتب)، مزاحمتی ادب (۱۹۹۷ء۔۲۰۰۷ء)، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

۱۱۔رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب: رویے اور رجحان، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع اول ۲۰۱۰ء

۱۲۔سی۔اے۔ قادر، ڈاکٹر، معاشریات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۴

۱۳۔ سی۔ اے۔ قادر، پروفیسر، اکرام رانا(تالیف وترجمہ)، کشاف اصطلاحات فلسفہ، بزمِ اقبال، لاہور، اشاعت اول۱۹۹۶،

۱۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ: حقیقیت سے علامت تک، اردورائٹرز گلڈ، الہ آباد، اشاعت اول ۱۹۸۰ء

۱۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، خودشناسی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

۱۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور لاشعور، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸،

۱۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تین بڑے نفسیات دان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء

۱۸۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، اشاعت اول ۲۰۰۰ء

۱۹۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ (جلد دوم)، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ، لاہور، طبع دوم، ۱۹۷۴

۲۰۔ سید احمد دہلوی، مولوی، (مرتبہ) فرہنگ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ لاہور، ۲۰۰۶ء

۲۱۔ شان الحق حقی، (مرتبہ و مترجم)، اوکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری، اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، گیارہویں طباعت، ۲۰۱۷،

۲۲۔ شفیق انجم، ڈاکٹر رشید امجد ایک مطالعہ، نقش گر، راولپنڈی، ۲۰۰۹ء

۲۳۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار: ڈاکٹر رشید امجد شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

۲۴۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ – بیسوی صدی کی تحریکوں اور رجحانات کی روشنی میں، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع دوم ۲۰۱۰،

۲۵۔ شہزاد منظر، جدید اردو افسانہ (تنقید)، منظر پبلی کیشنز، کراچی، اشاعت اول ۱۹۸۲،

۲۶۔ شہزاد احمد، ژونگ – نفسیات اور مخفی علوم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

۲۷۔ شیر محمد اختر، سگمنڈ فرائڈ (حالات زندگی اور نظریات)، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۴ء

۲۸۔ صبا اکرام، جدید افسانہ۔ چند صورتیں، فکشن گروپ آف پاکستان، کراچی، اشاعت اول ۲۰۰۱ء

۲۹۔ صوفی گلزار احمد، پروفیسر، فرہنگ نفسیات، ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۱ء

۳۰۔ صوفی گلزار احمد (مرتب)، کشاف اصطلاحات نفسیات، مقتدرہ، اسلام اباد، طبع اول ۱۹۹۲ء

۳۱۔ عائشہ بیگم، تاریخ اور سماجیات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء

۳۲۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی، اسلام آباد، طبع دوم ۲۰۱۰

۳۳۔ فیروز الغات، جلد اول، فیروز سنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

۳۴۔ قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، اشاعت ہشتم ۲۰۱۵ء

۳۵۔ قاضی عبد القادر، ڈاکٹر، کشاف اصطلاحات فلسفہ (اردو–انگریزی)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء

۳۶۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۰

۳۷۔ لینن، سامراج اور سامراجی، فکشن ہاؤس، لاہور، اشاعت اول ۲۰۱۲ء

۳۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی شکستگی، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶، ص ۵

۳۹۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی باتیں، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶

۴۰۔ محمد صدیق قریشی، کشاف اصطلاحات سیاسیات۔ جلد اول، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۴۱۔ مولوی نور الحسن نیر ، نوراللغات : جلد اول ، نیشنل بک فاؤنڈیشن ، اسلام آباد ، طبع سوم ۲۰۰۶ء

۴۲۔ محمد عبداللہ خان خویشگی، فرہنگ عامرہ، طبع اول ۱۹۸۹ء

۴۳۔ مہذب دہلوی (مرتب)، مہذب الغات، سمتا پرنٹنگ پریس، لکھنؤ، ۱۹۶۷ء

۴۴۔ ناہید قمر، ڈاکٹر، اردو فکشن میں وقت کا تصور، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

۴۵۔ نورالحسن نیر، مولوی، نور الغات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع سوم ۲۰۰۶

۴۶۔ نوازش علی، ڈاکٹر، رشید امجد کے افسانوں کی اسلوبیاتی اساس (مضمون)، مشمولہ: رشید امجد منتخب افسانے، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۸ء

۴۷۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، سگمنڈ فرائڈ۔ نظریہ تحلیل نفسی، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۹

۴۸۔ وِل ڈیورانٹ، نشاطِ فلسفہ، مترجمہ ڈاکٹر محمد اجمل، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۹ء

انگریزی کتب

49. Clifford Williams, Hackett, Free will and determinism (a diolog) , publishing compny, inianapolis, Indiana, 1980

50. Edward D'Angelo , The Problem of Freedom and Determinism , university of the Missouri press, Columbia, 1968

51. Joyce M. Hawkins and Robert Allen, the Oxford Encyclopedic English Dictionary, Clarendon Press. Oxford, 1991

52. Webster ComprehensiveDictionary, J.G. Ferguson Publishing compny ,Chicago,1977

رسائل/جرائد

ا۔ الماس، جامعہ عبداللطیف بھٹائی، خیرپور، شمارہ:۲۰، ۲۰۱۸ء

۲۔ تحقیقی جریدہ، (جنوری-جون)، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ، شمارہ:۷، ۲۰۲۰ء

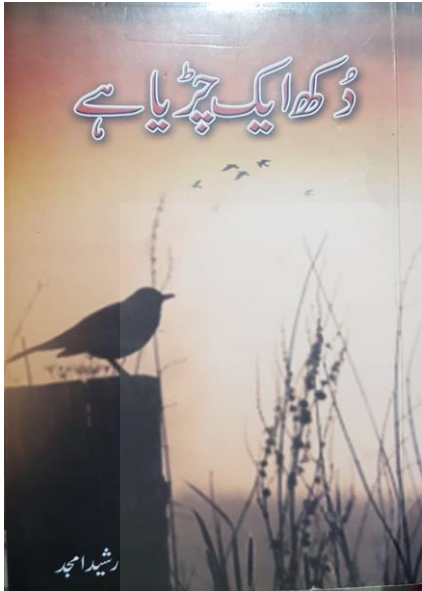


ضمیمہ

ڈاکٹر رشید امجد (فائل فوٹو)



زیر تحقیق افسانوی مجموعے کا عکس



نمونۂ تحریر

لمحہ ناموجود میں موجود

یہ حجرہ تھا کہ جہاں کوئی نہیں آتا تھا اور نہ یہاں سے کہیں جانے کی صورت تھی۔ اس طرح کے حجرے آس پاس دور دور تک پھیلے ہوئے کائنات جو زماں و مکاں سے ماوراء تھی۔ زماں تو بالکل نہیں، البتہ مکاں ہے لیکن یہ کیسا مکاں ہے کہ اس کے ہونے کا احساس تو ہے لیکن اس کی حدود کیسی ہیں اور وہ خود موجود ہے لیکن وجود نہیں رکھتا، بس وجود کا احساس ہے اور ایک خواب ہے۔ بہت ہی طویل، نہ ختم ہونے والا خواب۔ جس کے مناظر بدلتے رہتے ہیں۔ یہ مناظر بہت خوشگوار ہیں اور اذیت دینے والے بھی۔ خوشگوار لمحات کے خواب طمانیت دیتے، یہ اس کے اچھے دنوں کی یادیں تھیں۔ اذیت دینے والے لمحے بھی اس کے تھے۔ اس کی زندگی سے جڑے ہوئے، تاسف بھرے، مگر اب پچھتاوے سے کیا فائدہ؟ اور ان سب کھٹے میٹھے لمحوں میں وہ سب تھے جو آنسوؤں بھری آنکھوں، آہوں اور سوگوار، اُترے چہروں کے ساتھ اُسے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ گلاب کے عرق کی خوشبوؤں، پھولوں کے مہکتے ہاروں اور گلاب کی پتیوں کے ڈھیر تلے اس حجرے میں، اب یہ سارے دھندلاتے چہرے اس کا کل سرمایہ تھے۔

اوپر بھی معمول اور یہاں بھی معمول تھے لیکن کسی کا کسی دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اداس حجروں کی یہ بستی، وقت سے ماوراء بس موجود تھی، اور ہر حجرے میں مقید وجود آپ اپنی نشانی اور گواہی تھا۔ دوسروں کی طرح اُس کے لواحقین، دوست احباب اور محلے دار اُسے سوگوار چہروں کے ساتھ یہاں چھوڑ گئے تھے۔ سب کچھ خواب کی طرح لگتا تھا اور یہ خواب شاید ابھی موجود تھا۔

سوتے جاگتے اور اونگھتے لمحوں میں، کہ یہ لمحے وقت کے عمومی لمحوں سے مختلف تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ ان کی طوالت کتنی ہے۔ سب کچھ ایک مونتاژ کی طرح لگتا تھا، جس کے ٹکڑے، مختلف اوقات میں فلم کی طرح آنکھوں میں چلنے لگتے۔ آنکھیں، معلوم نہیں یہ آنکھیں تھیں یا صرف احساس، بس محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی صورت موجود ہے۔ کس صورت؟ --- یہ اُسے معلوم

نہیں تھا کہ اب اس کا وجود طبعی طور پر موجود ہے یا نہیں، یا وہ اب صرف ایک تصوری جھلک ہے۔ اصل صورت کیا تھی؟ ذائقے نہیں تھے، لیکن ذائقوں کا احساس تھا۔ خوف نہیں تھا، خوشی نہیں تھی، لیکن ان کا احساس تھا، تو یہ زندگی کا کونسا رُخ ہے۔ ہے بھی کہ نہیں۔ کبھی تھا کہ آس پاس کی گہما گہمی کی نرم گرم حدت وجود کو ہرا بھرا رکھے ہوئے تھی، لیکن اب یہ گہما گہمی نہیں تھی۔ تنہائی بھی نہیں تھی کہ اس کی ساری زندگی کی شباہتیں آس پاس موجود تھیں۔ یہ دریچے تھے، جو کھلتے بند ہوتے رہتے تھے۔ کسی ایک دریچے میں پہنچ کر وہ جانے کتنی دیر، کہ وقت موجود نہیں تھا، یا موجود تھا تو اس کی رفتار و تصور مختلف تھا، اپنا تماشا خود کرتا، کبھی اپنے کردار کے کسی عمل پر ہنستا، کبھی تاسف کا اظہار کرتا اور کبھی دل گیر ہو جاتا۔ ان میں خوشی کے دورانیے بھی تھے اور اُداس و غمگیں کر دینے والے لمحے بھی۔

بہر حال اب یہی حجرہ اس کی کل کائنات تھا۔ ایک ایسی --- غیر معمول کی خواہش اکثر وہاں بھی پریشان کیے رکھتی تھی اور یہاں تو غیر معمول کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ یہاں اس کے اعمال تھے، سوال کرنے والا بھی وہی اور جواب دینے والا بھی وہی لیکن یہ چند لمحے جو وقت کی دسترس سے باہر تھے، اور ہر شے سے بے نیاز، نہ کسی شے کی طلب، نہ انتظار کی بے چینی۔ بے چینی تو کسی بھی طرح کی نہ تھی، لیکن سکون بھی نہیں تھا، کوئی شے کہیں نہ کہیں کلبلاتی رہتی تھی۔

وقت سے ماوراء یہ چند لمحے، یا سال، یا صدیاں۔ کون جانے صبح کب ہوگی۔ اطمینان اور بے اطمینانی کا یہ مسرت آمیز کرب کتنا طویل ہوگا، یا بہت ہی مختصر۔ اس لمحے کا انتظار جب اُسے اٹھایا جائے گا اور وہ کہے گا: ''مجھے تو یہاں آئے چند لمحے ہی گزرے ہیں۔''

ان چند لمحوں کی قیمت چکانے کے لیے وہ اور اس کا یہ حجرہ مکاں میں ہوتے ہوئے بھی بے مکاں ہے۔

اُس لمحہ ابد تک جس کے سرے ازل سے جڑے ہوئے ہیں!

یا خدا! یہ لازوال ہونے کی خوشی نما اذیت بھی کیا شے ہے۔؟

رشید امجد۔ مختصر تعارف

i. احوال و آثار

رشید امجد ۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو سری نگر، کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام اختر رشید ہے۔ مگر وہ اپنے قلمی نام "رشید امجد" سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد کا نام غلام محی الدین مونس نقشی تھا جو کہ صوفیانہ طبعیت، سادہ مزاج اور نیک صفت انسان تھے۔ شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ پنجابی، فارسی اور کشمیری زبان پر دسترس تھی۔ رشید امجد کی والدہ خورشید بیگم مذہبی رجحان رکھتی تھیں۔ مزارات پر جانا ان کی اولین ترجیحات میں تھا۔ رشید امجد اپنے والدین کی دعاؤں اور منت مرادوں سے دس سال بعد پیدا ہوئے۔ والد قالین کے مشہور ڈیزائنر تھے اور قالین ساز فیکٹری میں ملازم تھے۔ ساتھ اپنا بھی قالینوں کا کاروبار کرتے تھے ۔جس کی وجہ سے گھر کے مالی حالات مستحکم تھے۔ رشید امجد کا سکول گھر سے دور ہونے کی وجہ سے تانگہ لگایا گیا ۔رشید امجد کا بچپن آسودہ حالات میں گزرا۔

قیام پاکستان کے وقت رشید امجد کے چند قریبی رشتہ دار راولپنڈی ہجرت کر آئے تھے جنہیں ملنے کے لئے ان کے والد نے اپنے خاندان کے ساتھ راولپنڈی آنے کا فیصلہ کیا۔ راولپنڈی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ کشمیر واپس جانے کے راستے بند ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے رشید امجد کے والد کو کافی پریشانی ہوئی اور مجبوراً راولپنڈی میں قیام پذیر ہونا پڑا۔ رشید امجد کی خود نوشت سوانح عمری "تمنا بے تاب" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی یاداشت بہت اچھی ہے۔ کیونکہ انہیں اپنے بچپن کا زمانہ، جب وہ کے جی میں پڑھتے تھے، سب اچھے سے یاد ہے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کشمیر سے حاصل کی۔ بچپن میں وہ کافی شرمیلے اور کم گو تھے۔ ان کے ہاں ایک ملازم تھا جسے "چاچا علیا" کہہ کر پکارتے تھے، ان سے دلی لگاؤ تھا۔ چاچا علیا گھر کے فرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ راولپنڈی میں رشید امجد کے والد کے پاس ذریعہ معاش نہ ہونے کی وجہ مالی مشکلات میں آئے روز اضافہ ہوتا گیا۔ ان کے والد نے کریانہ سٹور کھولا جس میں کافی نقصان ہوا اور فروخت کر دیا۔ رشید امجد کے والد قالین ڈایزائنر تھے، اور سری نگر میں اچھا کما رہے تھے۔ راولپنڈی میں ایسا کوئی کارخانہ نہیں تھا جہاں وہ کام کرتے۔ رشید امجد کی ماں کے زیورات اور کچھ بچی کچی رقم سے گزر بسر ہوتا رہا۔

جب ان کے والد کو واپس جانے کی کوئی امید نہ رہی تو انہیں مجبوراً مستقل سکونت اختیار کرنی پڑی۔ رشید امجد کو محلے کے ایک سکول میں داخل کروادیا گیا۔ آٹھویں کا امتحان راولپنڈی کے علاقہ موہن پورہ میں پاکستان گرلز ہائی سکول سے پاس کیا اور میٹرک ڈینیز ہائی سکول سے ۱۹۵۵ء میں پاس کیا۔ رشید امجد کا زمانہ طالب علمی کسمپرسی اور مشکلات سے دوچار رہا۔ سکول کے لئے جیب خرچ نہیں ملتا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے گھر کے برتن چوری کر کے بیچتے رہے۔ جو بعد میں والدہ کو معلوم پڑنے پر اتنی مار پڑی کی جسم پر نیل پڑ گئے۔ مالی حالات کی وجہ سے ان کی والدہ کا مزاج سخت ہوتا گیا۔ ماں باپ میں سرد مہری کی فضا اس حد تک بڑھ گئی کہ گھر کم اور جنگ کا میدان زیادہ نظر آتا۔ والدین کی لڑائی جھگڑوں نے رشید امجد پر گہرے اثرات مرتب کئے جو بعد ازاں ان کے افسانوں میں لاشعوری طور پر سامنے آئے۔

رشید امجد کا زمانہ طالب علمی نشیب و فراز کا شکار رہا۔ اصغر مال کالج میں ایف اے میں داخلہ لیا۔ ماں نے اپنی انگوٹھی بیچ کر دو ماہ کی فیس رشید امجد کو دی، جو انہوں خود پر خرچ کر دی۔ فیس کی عدم ادائیگی کی وجہ سے کالج سے نام کٹ گیا۔ رشید امجد تمنا بے تاب صفحہ ۳۳ پر لکھتے ہیں:

> " ایک بار دو ماہ کی اکھٹی فیس جمع کروانا تھی۔ امی نے اپنی انگوٹھی بیچ کر پیسے اکھٹے کئے۔ میں نے فیس کالج جمع کروانے کی بجائے اسے ادھر ادھر خرچ کر دیا۔ دو ایک مہینے اسی طرح گزر گئے۔ اس کے بعد میرا نام کٹ گیا"۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ ایک دن فٹ پاتھ پر بیٹھے تھے تو ایک آدمی نے پاس آکر کہا "نوکری کرو گے" انہوں نے ہاں میں جواب دیا۔ اس نے رشید امجد کو اپنی بھینس کی دیکھ بھال کے لئے رکھ لیا۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا اور دو دن میں ہی حشر ہو گیا۔ والدہ واپس گھر لے گئی اور چند دنوں بعد گنج منڈی میں ایک عزیز کے پاس کریانہ کی دکان پر منشی رکھوا دیا۔ ڈیڑھ سال یہاں کام کیا۔ ان دنوں والد لاہور میں تھے۔ جو پہلے تو بے روزگار رہے بعد ازاں کسی قالین کی فیکٹری میں ملازمت مل گئی۔ اب گھر کے حالات قدرے بہتر تھے۔ علیا چاچا بھی کشمیر سے راولپنڈی منتقل ہو چکے تھے اور ان کی مالی معاونت کرتے تھے۔ اس کے بعد رشید امجد کسی دور کے عزیز کے توسط سے پی ڈبلیو ڈی کے محکمے میں اوورسئیر کے ساتھ بطور ٹائم کیپر کام کرنے لگے۔ جہاں ٹھیکدار اور ان کے کام پر نظر رکھنا ہوتا تھا۔ یہ ہندوؤں کے اوقاف کی برانچ میں تھے جہاں گھروں کی مرمت وغیرہ کا کام کیا جاتا تھا۔ اس دوران ان کی ملاقات منشا یاد سے ہوئی۔

رشید امجد 'تمنا بے تاب' میں لکھتے ہیں کہ " میں ایک دن دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک پینڈو، جس کے ہاتھ میں ٹین کا بکسہ تھا، اندر داخل ہوا۔ یہ منشا یاد تھا"۔ منشایاد بطور ورکس انسپکٹر آیا تھا۔ چند دنوں میں منشایاد سے تعلق دوستی میں بدل گیا۔ منشایاد نے اسے بتایا کہ وہ افسانے لکھتا ہے۔ اس وقت رشید امجد لفظ 'افسانہ' سے ناآشنا تھے ۔ اور انہوں نے کہا یہ افسانہ کیا ہوتا ہے ؟۔ منشایاد اپنی کہانیاں انہیں سنایا کرتے۔ رشید امجد کو ان دنوں جاسوسی کہانیاں اور ناول پڑھنے کا جنون تھا۔ یہ جنون وہ محلے کی آنہ لائبریوں سے پورا کرتے تھے۔ منشایاد کی کہانیوں میں انہیں دلچسپی کم تھی۔ بعد اذاں منشایاد مری ٹرانسفر ہو گئے اور وقتی طور پر ان سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ یکم جنوری ۱۹۵۹ء میں رشید امجد ۵۰۱ ورکشاپ میں بطور کلرک ملازم ہو گئے۔ اپنا کام ایک دو گھنٹوں میں مکمل کر لیتے۔ بقیا وقت وہ جاسوسی ناول پڑھنے میں گزار دیتے۔ اسی دفتر میں ان کی ملاقات 'اعجاز حسین' سے ہوئی۔ ان سے زیادہ شناسائی کی وجہ کتب بنی تھا، اعجاز حسین بھی اپنے ساتھ کتب لایا کرتا تھا۔ کتابوں کے تبادلے نے قربت بڑھا دی۔ اعجاز حسین نے انہیں بتایا کہ وہ 'اعجاز راہی' کے نام سے افسانے لکھتا ہے۔ رشید امجد 'تمنا بے تاب' میں لکھتے ہیں کہ " ایک دن اعجاز راہی نے مجھے اپنی ایک کہانی پڑھنے کو دی۔ کہانی پڑھ کر میں نے اسے کہا، ایسی کہانی تو میں بھی لکھ سکتا ہوں"۔ یہ ایسا موڑ تھا، جہاں رشید امجد کے لئے ایک نیا جہان منتظر تھا۔ یہ لمحہ انہیں ایک دبستان کی حیثیت تک لے گیا۔ اعجاز راہی کے اصرار پر انہوں نے ایک کہانی لکھ کر انہیں دی۔ اس کہانی کو پڑھ کر اعجاز راہی نے کافی تعریف کی۔ ڈاکٹر شفیق انجم لکھتے ہیں۔

> " اعجاز راہی نے رشید امجد کی پہلی کہانی پر جس طرح کے تاثرات ظاہر کیے اس سے تحریک پا کر دو تین کہانیاں اور لکھیں اور اس دور کے ایک مشہور فلمی رسالے "رومان" کو اختر رشید ناز کے نام سے برائے اشاعت بھیج دیں"۔

اعجاز راہی نے ان کی ملاقات اپنے قریبی ساتھیوں سے کرائی۔ جن میں نثار ناسک، علیم درانی ،سبطِ احمد اور سلیم المظفر شامل تھے۔ یہ نئے لکھاریوں کی صف کے چند معتبر نام تھے، رشید امجد بھی اس صف میں شامل ہو گئے۔ رشید امجد کی پہلی کہانی جو "رومان" مین بھیجی گئی تھی، شائع ہونے پر اپنی صف میں باقاعدہ افسانہ نگار کی حیثیت حاصل کر لی۔ اعجاز راہی کی قربت نے رشید امجد کو ادبی مسافر بنا دیا۔ اس سفر میں رشید امجد کی علمی و ادبی بصیرت بڑھتی چلی گئی۔ اسی دوران ادبی حلقوں میں شمولیت اور نمائندگی رشید امجد کے لئے پہچان کا ذریعہ بنی۔

اعجاز راہی کے حلقہ احباب نے 'بزم میر' کے نام سے ایک ادبی انجمن کا قیام عمل میں لایا۔ جس میں رشید امجد بزم کی مجلس عاملہ میں شامل تھے۔ بزم میر کے جلسوں میں دیگر نوجوان اور بزرگ کی شرکت بھی ہونے لگی۔ ان میں نثار ناسک جو بزم کے سیکرٹری تھے، ان کے استاد غلام رسول طارق بھی آتے تھے۔ رشید امجد نے ایک جلسے میں اپنا افسانہ 'سنگم' پڑھ کر سنایا تو جلسے کے اختتام پر غلام رسول طارق نے علیحدہ ملاقات کی پیشکش کی اور ساتھ یہ افسانہ لانے کو بھی کہا۔ رشید امجد کو بھی ابتدائی سطح پر ایک استاد کی ضرورت تھی جو ان کی صورت میں میسر آیا۔ غلام رسول طارق فرنٹیئر پریس میں مینیجر تھے۔ جو شاعر، افسانہ نگار اور اچھے نقاد بھی تھے۔ رشید امجد سے ملاقات میں انہوں نے افسانے کے چند جملے درست کرائے اور اسے "ادب لطیف" میں بھیجنے کا کہا۔ ادب لطیف میرا ز ادیب کی ادارت میں نقوش کے بعد بڑا رسالہ تھا۔ اسی دوران انہوں نے رشید اختر ناز کی بجائے قلمی نام "رشید امجد" تجویز کیا۔ یہ نام رشید امجد کی پہچان بن گیا۔ رشید امجد تمنا بے تاب میں لکھتے ہیں کہ غلام رسول طارق نے انہیں کہا" اختر رشید ناز، یہ ناز واز اب نہیں چلتا کوئی ڈھنگ کا نام رکھو۔ کافی نام زیر غور آئے آخر رشید امجد طے پایا"۔ یوں رشید امجد کا پہلا با قاعدہ ادبی افسانہ "سنگم" ادب لطیف میں شائع ہوا۔ میرزا ادیب نے کہانی پڑھ کر جوابی خط میں کہانی کی تعریف کی اور بتایا کہ اسی شمارے میں یہ کہانی شائع کی جارہی ہے۔ لہذا" سنگم "ادب لطیف کے ستمبر ۱۹۶۰ء کے شمارے میں منظر عام پر آیا۔ رشید امجد نے اپنی دوسری کہانی غلام رسول طارق کی مشاورت سے ادبی مجلہ " داستان گو" کو بھیجی، جس کے مدیر اشفاق احمد تھے۔ یہ کہانی بھی شائع ہو گئی۔ اس کے بعد رشید امجد کے افسانے مختلف ادبی مجلوں میں تواتر سے چھپنے لگے۔ اب جاسوسی اور فلمی کہانیوں کا رشید اختر ناز گم ہو گیا اور رشید امجد کی صورت میں نیا نام سامنے آیا۔ ان کہانیوں کی اشاعت نے رشید امجد کے نام کو ادبی حلقوں میں متعارف کروایا۔ یہ آغاز اردو ادب کے لئے نئ راہوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور مارشل لا دور میں علامتی افسانے کے علمبر دار کی صورت میں سامنے آیا۔ غلام رسول طارق نے ان کی بہترین رہنمائی کی۔ جس کا ذکر تمنا بے تاب میں نہایت تکریم کے ساتھ کیا گیا ہے۔ وہ اپنی کہانیاں غلام رسول طارق کو دکھاتے تھے، وہ سنتے، دیکھتے اور اکثر پھاڑ دیتے اور لکھنے کے نئے زاویے بتاتے۔ کبھی کہانی کو درمیان سے لکھنے کو کہتے اور کبھی آخر سے فلیش بیک میں۔ یہ مشق رشید امجد کے لیے سونے پہ سہاگے کا کام کرتی رہی۔۔

غلام رسول طارق کی بدولت رشید امجد کو ادبی حلقوں میں جانے کا موقع ملتا رہا۔ جس سے انہوں نے بھرپور استفادہ حاصل کیا۔ رشید امجد اکثر غلام سول طارق اور ان کے رفقا استاد صادق نیازی اور استاد ضبط قریشی کی محفل میں شرکت کرتے تھے۔ یہ اس وقت راولپنڈی کے استاذالشعرا میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی نشست میں زیادہ گفتگو شاعری پر ہوتی۔ رشید امجد واحد نوجوان افسانہ نگار اس نشست کا حصہ ہوتے۔ یہ اعزاز ان کو غلام رسول طارق کے باعث ملا۔ جو ایک دوست اور استاد کی صورت میں میسر آیا۔

حلقہ ارباب ذوق میں شرکت کا موقع بھی استاد طارق کی بدولت ملا۔ ان دنوں آغا بابر حلقہ کی سیکرٹری تھے اور استاد طارق کے اچھے دوست بھی۔ استاد طارق کی سفارش پر رشید امجد کو دوماہی پروگرام میں افسانہ سنانے کا موقع ملا۔ انہوں نے تمنا بے تاب صفحہ ۲۸ پر لکھا کہ "اتنی خوشی مجھے کسی رسالے میں چھپنے سے نہیں ہوئی تھی جتنی اس دوماہی پروگرام میں نام آنے سے ہوئی"۔

رشید امجد بطور افسانہ نگار اپنا نام بنا چکے تھے۔ ان کے افسانے مختلف ادبی رسائل میں چھپتے رہے۔ حلقہ اور دیگر ادبی نشستوں میں بھی رشید امجد کی پہچان ہو چکی تھی۔ لیکن ایک کمی تعلیم کی تھی جسے رشید امجد نے محسوس کیا۔ استاد طارق نے بھی تعلیمی سلسلہ کے منقطع ہونے پر تشویش کا اظہار کیا اور دوبارہ اس کو شروع کرنے کا کہا۔ رشید امجد نے ایف اور بی اے کا امتحان پرائیویٹ پاس کیا۔ اس کے بعد گورڈن کالج راولپنڈی سے ۱۹۶۷ء میں ایم اے اردو کیا۔

رشید امجد کو اگر استاد طارق کی صحبت میسر نہ آتی تو شاید وہ کبھی ادبی دنیا میں قدم نہ جما سکتے۔ ان کی ابتدائی ادبی دور میں ترقی پسند طبقے کی اجارہ داری تھی۔ ان میں بہت سے سینئر لوگ شامل تھے۔ آپسی اختلافات کے ساتھ نئے لکھاریوں کے ساتھ ناروا سلوک رکھتے تھے۔ اس ردعمل نے اس وقت کی نئی پود کو تحرک فراہم کیا۔ جس کے تناظر میں علامتی افسانے میں پیش رفت ہوئی۔ رشید امجد خود لکھتے ہیں کہ۔

> "اگرچہ ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ جلسے بند تھے لیکن ترقی پسند ابھی تک پورے دم خم کے ساتھ موجود تھے۔ یہ ہم سے سینئر نسل تھی اور کافی حد تک متکبر، ہمارے جلسوں میں آنا تو ایک طرف وہ نجی محفلوں میں بھی منہ لگانے کے لئے تیار نہ تھے"۔(تمنا بے تاب ص۵۶)

نئی نسل میں ادبی رجحان اب تحریک پکڑ چکا تھا۔ نئے لکھاریوں میں وزیر آغا کی کتاب 'شام اور سائے'، جیلانی کامران کی کتاب 'استانزے' اور افتخار جالب کی کتاب 'ماخذ' کے دیباچے زیر بحث تھے۔ رشید امجد کی دلچسپی 'ماخذ' کے دیباچے میں زیادہ تھی۔ جس میں نظم کی لسانی تشکیلات کو افسانوی مثالوں میں لکھا گیا تھا۔ رشید امجد کو افتخار جالب سے ملنے کا اشتیاق لاہور لے گیا۔ طویل ملاقات میں لسانی تشکیلات پر سیر حاصل گفتگو ہوئی اور وہ ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ ان کی تخلیقی و فنی مہارت کو جدید افکار کی طرف راغب کرنے میں بنیادی کردار افتخار جالب کا ہے۔

اسی دوران رشید امجد کی ملاقات وزیر آغا سے ہوئی۔ وزیر آغا کی شخصیت نے رشید امجد کو بہت متاثر کیا۔ ادبی جلسوں میں شرکت اور وزیر آغا سے تعلق نے قربت بڑھا دی اور وہ رشید امجد کے اچھے دوست بن گئے۔ وزیر آغا سے انہوں بہت کچھ سیکھا۔ تمنا بے تاب میں لکھتے ہیں کہ وزیر آغا جتنا صاحبِ مطالعہ شخص میں نے نہیں دیکھا۔ وزیر آغا نے رشید امجد کو پی ایچ ڈی کی طرف مائل کیا اور مقالہ مکمل ہونے پر وہ ان کے ممتحن بھی تھے۔ سر سید کالج میں تدریسی عمل کے ساتھ ۱۹۹۲ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ ایم اے کرنے کے بعد یکم نومبر ۱۹۶۸ء میں سی بی کالج واہ کینٹ میں بطور لیکچرار تقرری ہوئی۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ سر سید کالج راولپنڈی میں ہو گیا۔ اور یہاں سے ترقی یاب ہو کر پروفیسر بنے اور اردو کے شعبہ صدر کی حیثیت سے ۲۰۰۰ء میں ریٹائیرڈ ہوئے۔ اس کے بعد نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز میں شعبۂ اردو کے صدر بھی رہے۔

۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے بعد حلقہ ارباب ذوق کی سرگرمیاں معطل تھیں۔ لہذا رشید امجد اور ان کے رفقا نثار ناسک، سبط احمد، اعجاز راہی اور سلیم المظفر نے "بزم میر" کے نام سے انجمن بنائی۔ جس کے تسلسل سے اجلاس منعقد کئے جاتے تھے۔ ان میں نئے لکھنے والوں کے ساتھ بزرگ بھی شامل ہوتے۔ کچھ عرصہ بعد منشا یاد بھی اس بزم کے اجلاس میں شرکت کے لئے آئے تو رشید امجد کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ اور ان کے تعلق کا سلسلہ دوبارہ بحال ہو گیا کیونکہ منشا یاد اب راولپنڈی شفٹ ہو چکے تھے۔ ایک وقت آیا کہ بزم میر کے اجلاس بند ہو گئے۔ رشید امجد اور اس کے ساتھیوں نے ایک نئی ادبی تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا جس کا نام " حلقۂ ذہنِ جدید" رکھا گیا۔ بقول رشید امجد: "جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہاں زیر بحث آنے والے موضوعات بزم میر سے قدرے مختلف تھے۔ علیم درانی اس کے سیکرٹری اور رشید امجد جوائنٹ سیکرٹری، باقی احباب مجلس عامہ کے رکن مقرر ہوئے۔ اس تنظیم کا مقصد جدید ادبی رجحانات کو زیر بحث لانا تھا۔ یہ سلسلہ کچھ عرصے تک چلتا رہا۔

حلقہ ارباب ذوق نے ۱۹۶۰ء کے بعد اجلاس منعقد کرنا شروع کر دیے تھے لیکن نئے لکھنے والوں کو وہاں جگہ نہیں دی جاتی تھی۔ اس بے رخی کے نتیجے میں "لکھنے والوں کی انجمن" کے نام سے نوجوان لکھاریوں نے ایک انجمن کا آغاز کیا۔ اس کے ہفتہ وار اجلاس میں تنقید صرف تخلیقی اصناف تک محدود نہ تھی بلکہ کتب، رسائل اور دیگر اصناف کو بھی شامل گفتگو کیا جاتا تھا۔ اس میں رشید امجد نے بطور سیکرٹری بہت محنت سے کام کیا اور نئی نسل کو بہترین ادبی پلیٹ فارم مہیا کیا۔ رشید امجد ساتھ ساتھ حلقہ ارباب ذوق کے جلسوں میں بھی جانے لگے۔ اور کچھ عرصے میں حلقہ میں اپنی نمائندگی کو یقینی بنالیا۔ یہ ان کی ذہنی بصیرت اور تخلیقی انفرادیت کی بدولت ہوا۔

رشید امجد حلقہ کی علمیانہ تربیت کے معترف ہیں۔ انہوں نے حلقہ میں پہلا افسانہ سنایا تو چند تلفظ اور دیگر اغلاط کی بدولت بہت منفی رد عمل کا سامنا کرنا پڑھا۔ حتیٰ کہ کچھ شرکا نے سیکرٹری بابر آغا کو کہا کہ ایسے نئے لکھاریوں سے پہلے افسانہ سن لیا کریں۔ ایسے رویے رشید امجد کے لئے تکلیف دہ تھے لیکن انہوں نے برداشت کیا اور بعد میں پہلے سے زیادہ شوق سے شامل ہوتے رہے۔ تمنا بے تاب میں لکھتے ہیں" یہ حلقہ کی تربیت تھی کہ جلسہ کے دوران ایک دوسرے کی کھال کھینچ دو لیکن بعد میں چائے اکٹھی پینی ہے"۔ حلقہ میں شمولیت کی وجہ سے "لکھنے والوں کی انجمن "زوال پذیر ہونا شروع ہوئی اور بالآخر ختم ہو گئی۔

ادبی دنیا میں قدم رکھنے سے رشید امجد کی ذاتی زندگی میں بھی ایک انقلاب کی صورت پیدا ہو گئی۔ جس مشکل اور گھٹن زدہ ماحول میں وہ جوان ہوئے، دوستوں کی رفاقت اور بزرگوں کی صحبت نے ذہنی خلفشار کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ رشید امجد کے والد ۱۹۶۰ء میں فوت ہو گئے تھے۔ ان کے بعد گھر کی تمام ذمہ داریاں انہی کے کندھوں پر تھیں۔ انہوں نے دن رات انتھک محنت کی، گھر اور باہر کے معاملات کو ایک سمت میں لائے، جس سے زندگی کی تاریکی میں کمی واقع ہوئی۔ کالج میں تدریسی شعبے نے زندگی کی شمع میں نئی روشنی پیدا کی۔ مالی حالات کافی مستحکم ہو گئے۔ انہوں نے اپنے مستقبل کے لئے ایک راہ کا تعین کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پختہ ارادے اور اچھے رفقا کی صحبت نے انہیں بہترین معلم، افسانہ نگار اور نقاد بنا دیا۔ رشید امجد نے اپنے کیئریئر میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے جن کی تفصیل ان کی خودنوشت "تمنا بے تاب" میں تفصیلاً درج ہیں۔

رشید امجد کے فکری ارتقا میں ان کی والدہ کا کلیدی کردار رہا ہے۔ والدہ کی مذہبی وابستگی کا اثر رشید امجد پر بھی ہوا۔ وہ کشمیر میں اکثر درباروں پر ان کے ساتھ حاضری دیتا۔ ان کی والدہ اکثر وظائف پڑھا کرتی۔ رشید

امجد بھی اپنی ماں کو دیکھ دیکھ کر وظیفے پڑھتا تھا۔ اس نے کہیں سن رکھا تھا کہ چاند کو مسلسل دیکھنے سے چاند پر پہنچ جاتا ہے۔ اس نے یہ عمل کرنا شروع کیا اور اسے ایسا لگا کہ وہ چاند پر ہے۔ اچانک وہ ڈر گیا اور والدہ کو بتایا۔ ایسے ہی سورج کو بار بار دیکھ کر آنکھیں سوجالی تھیں۔ رشید امجد کا گھریلو ماحول کافی تذبذب کا شکار تھا۔ ان کے افسانوں میں لاشعوری طور پر تمام واقعات جمع ہوتے گئے۔ یہ لاشعوری محرکات ان کی تخلیقی قوت بنی۔

رشید امجد کی ادبی زندگی کا آغاز ۶۰ کی دہائی میں ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب ترقی پسند تحریک ہچکولے کھا رہی تھی۔ مارشل لا، ۶۵ء کی جنگ، ایوب اور فاطمہ جناح کا مقابلہ، یہ ایسے واقعات تھے جس نے سیاسی و سماجی حالات پر گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ آزادی رائے پر تالے لگا دیے گئے تھے۔ رشید امجد ان سب حالات کا حصہ تھے۔ انہوں نے علامتی اور تجریدی اسلوب کو اپنایا اور جدید افسانہ لکھنا شروع کیا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "بیزار آدم کے بیٹے" ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد معاصر ناقدین کی طرف کافی پذیرائی ملی۔ اس کے بعد ان کے ۱۳ افسانوی مجموعے اور ۲ کلیات شائع ہو چکی ہیں۔ منتخب افسانوں کی ۵ کتب منظر عام پر آچکی ہے جن میں "گملے میں اگا ہوا شہر" نیشنل بک فاؤنڈیشن نے شائع کی، جس کے افسانوں کا انتخاب رشید امجد نے خود کیا۔ "دکھ ایک چڑیا ہے" جس کا تجزیاتی مطالعہ اس مقالے میں کیا گیا ہے، نیشنل بک فاؤنڈیشن نے ۲۰۱۶ء میں شائع کیا۔ رشید امجد کا آخری افسانوی مجموعہ "کہانی نے خواب دیکھا" صریر پبلیکیشنز نے ۲۰۲۰ء میں شائع کیا۔ علاوہ ازیں بیسیوں افسانے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے جو کسی مجموعے کا حصہ نہ بن سکے۔

انہوں نے پاکستانی ادب کے نام سے چھ جلدیں مرتب کیں۔ ان کا یہ کام پاکستان میں اردو ادب پر ایک احسان عظیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں پاکستانی ادب کی جملہ اصناف کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، پاکستانی ادب میں اہم اور بنیادی مواد کی کانٹ چھانٹ کر کے ایک شکل میں لانا انتہائی مشکل کام تھا لیکن ان کی انتھک محنت اور لگن کی بدولت یہ پایہ تکمیل تک پہنچا۔ رشید امجد کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "رویے اور شناختیں" اور "یافت دریافت" بالترتیب ۱۹۸۸، ۱۹۸۹ میں شائع ہوئے۔ انہوں نے اپنے مضامین میں معاصر ادبا کے فن، کتب کا تجزیہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں۔ جن میں غالب اور اقبال کے افکار کو بھی تجزیاتی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ رشید امجد کی خودنوشت "تمنا

بے تاب" کے نام سے پہلا ایڈیشن ۲۰۰۱ء میں حرف اکیڈمی سے شائع ہوا۔ ۲۰۰۷ء میں انہوں نے پورب اکادمی سے "تمنا بے تاب" کو از سر نو ترتیب دیا اور مزید اضافہ کیا۔ تھرڈ ایڈیشن کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں:

"پہلے ایڈیشن میں کمپوزر کی لاپرواہی کی وجہ سے اتنی اغلاط ہوئیں کہ تحریر کا تسلسل ہی ٹوٹ گیا اور کئی حصے کمپیوٹر میں ہی رہ گئے۔ اس ایڈیشن میں یہ سارے صفحات شامل ہیں اور کئی اضافے بھی کئے گئے ہیں"۔

رشید امجد نے ملکی و غیر ملکی ادبی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ بہت سے مجالس کی صدارت کی۔ انہوں نے سینکڑوں تنقیدی مضامین مختلف ادبی پرچوں میں تواتر سے لکھے۔ رشید امجد سرکاری و نجی طور پر ادبی محافل میں بطور صدر، مہمان اور ناقد کی حیثیت سے اکثر شامل ہوتے رہے۔ انہیں مختلف فورم پر ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔ ۲۰۰۶ء میں بہترین کارکردگی پر صدارتی حسن کارکردگی ایوارڈ بھی دیا گیا۔

رشید امجد کی ادبی خدمات پر ملکی و غیر ملکی جامعات میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کی سند دی گئی۔ ان مقالات میں رشید امجد کے فکر و فن کو مختلف تحقیقی مراحل سے گزارا گیا۔ زیر نظر مقالہ بھی ان کے افسانوی مجموعہ "دکھ ایک چڑیا ہے" کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ جس میں معاصر زندگی میں جبریت اور خوف کے سماجی و نفسیاتی تناظرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ رشید امجد ۳ مارچ ۲۰۲۱ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ پسماندگان میں ان کے ۳ بچے اور بیوی شامل ہیں۔ اللہ رشید امجد کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔

ii. کوائف

نام: اختر رشید

قلمی نام: رشید امجد / ڈاکٹر رشید امجد

والد: غلام محی الدین مونس نقشی

والدہ: خورشید بیگم

پیدائش: ۵ مارچ ۱۹۴۰ء۔ محلہ نواب شاہ۔ سری نگر، کشمیر

وفات: ۳مارچ۲۰۲۱ء(تدفین ۵مارچ۲۰۲۱ء)، گلستان کالونی، راولپنڈی

تعلیم: ابتدائی تعلیم۔اپریل ۱۹۴۵ء تا اگست ۱۹۴۷ء۔ برن ہال سکول، سری نگر، کشمیر

مڈل۔۱۹۵۳ء۔ پاکستان ماڈل سکول، موہن پورہ، راولپنڈی

میٹرک۔۱۹۵۵ء۔ڈینیز ہائی سکول رولپنڈی۔

ایف اے۔۱۹۶۲ء، پرائیویٹ

بی اے۔۱۹۶۴ء۔پرائیویٹ

ایم اے (اردو)۔۱۹۶۷ء، گورڈن کالج راولپنڈی

پی ایچ ڈی۔ ۱۹۹۲ء

شادی: ۱۲مئی ۱۹۷۶ء

بیگم: رخسانہ خورشید

بچے: تین

بیٹی سعدیہ (پیدائش ۱۹۷۷ء)

بیٹا حسن (پیدائش ۱۹۸۲ء)

بیٹا حسین (پیدائش ۱۹۸۴ء)

پتہ: ۵۲۔سی، لین ۷اے، گلستان کالونی، راولپنڈی

ملازمت

پی ڈبلیو ڈی کی ملازمت بطور ٹائم کیپر ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۴ء

۵۰۱۔سنٹرل ورکشاپ چکلالہ، بطور کلرک ۱۹۶۶ء

بطور اورینٹل ٹیچر، سی بی سکول، دریا آباد، راولپنڈی	۱۹۶۶ء
لیکچرار، سی بی کالج، واہ کینٹ، راولپنڈی	۱۹۶۸ء
لیکچرار، ایف جی سر سید کالج، راولپنڈی	۱۹۷۱ء
اسسٹنٹ پروفیسر اردو۔ ایضاً	۱۹۷۸
ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو۔ ایضاً	۱۹۹۳ء
پروفیسر اردو۔ ایضاً	۱۹۹۹ء
پروفیسر وصدر شعبہ اردو۔ نمل، اسلام آباد	۲۰۰۱ء تا
پروفیسر اردو۔ جامعہ اسلامیہ بین الاقوامی، اسلام آباد	
پروفیسر اردو۔ فاطمہ جناح یونیورسٹی، راولپنڈی	

افسانوی مجموعے

۱۔	بیزار آدم کے بیٹے	دستاویز پبلشرز، راولپنڈی، ۱۹۷۴ء
۲۔	ریت پر گرفت	دستاویز پبلشرز، راولپنڈی، ۱۹۷۸
۳۔	سہ پہر کی خزاں	دستاویز پبلشرز، راولپنڈی، ۱۹۸۰ء
۴۔	پت جھڑ میں خود کلامی	اثبات پبلیکیشنز، راولپنڈی، ۱۹۸۴ء
۵۔	بھاگے ہیں بیاباں مجھ سے	مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء
۶۔	دشتِ نظر سے آگے (کلیات)	مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۱ء
۷۔	عکس بے خیال	دستاویز مطبوعات، راولپنڈی، ۱۹۹۳ء
۸۔	دشتِ خواب	مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۳ء

۹۔ کاغذ کی فصیل — دستاویز مطبوعات، راولپنڈی، ۱۹۹۳ء

۱۰۔ گم شدہ آواز کی دستک — فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۶ء

۱۱۔ ست رنگے پرندے کے تعاقب میں — حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء

۱۲۔ ایک عام آدمی کا خواب — حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۶ء

۱۳۔ عام آدمی کے خواب (کلیات) — پورب اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۷ء

۱۴۔ دکھ ایک چڑیا ہے۔ — نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

۱۵۔ کہانی نے خواب دیکھا — صریر پبلی کیشنز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء

افسانوی انتخاب

۱۔ رشید امجد کے منتخب افسانے (انتخاب: ڈاکٹر نوازش علی) — دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۸ء

۲۔ گملے میں اگا ہوا شہر (انتخاب: رشید امجد) — نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

۳۔ لیمپ پوسٹ اور دوسرے افسانے — صریر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۲۰ء

۴۔ سناٹا بولتا ہے اور دوسرے افسانے — صریر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۲۰ء

۵۔ سمندر مجھے بلاتا ہے اور دوسرے افسانے — صریر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۲۰ء

۶۔ گملے میں اگا ہوا شہر اور دوسرے افسانے — صریر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۲۰ء

تحقیق و تنقید

۱۔ نیا ادب — تعمیر ملت پبلشرز منڈی بہاؤالدین، ۱۹۶۹ء

۲۔ رویے اور شناختیں — مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۸ء

۳۔ یافت دریافت — مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۹ء

۴۔ شاعری کی سیاسی فکری روایت — دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۳ء

۵۔ میراجی شخصیت اور فن — مغربی پاکستان اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۵ء

۶۔ پاکستانی ادب۔ رویے اور رجحانات — پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

ترتیب وتالیف

۱۔ پاکستانی ادب (چھ جلدیں) — ایف.جی سرسید کالج، راولپنڈی، ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۴ء

۲۔ اقبال فکر وفن — ندیم پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۸۴ء

۳۔ تعلیم کی نظریاتی اساس — ندیم پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۸۴ء

۴۔ مرزا ادیب، شخصیت وفن — مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۱ء

۵۔ پاکستانی ادب (نثر) ۹۰ء — اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء

۶۔ پاکستانی ادب (نثر وافسانہ) ۹۱ء — اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

۷۔ پاکستانی ادب (نثر وافسانہ) ۹۴ء — اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء

۸۔ مزاحمتی ادب (۸۰۔۱۹۹۷ء) — اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء

۹۔ مزاحمتی ادب (۷۰-۱۹۹۹ء) — اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

۱۰۔ پاکستانی ادب (انتخاب افسانہ اردو) ۲۰۰۸ء۔۱۹۴۷ء)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

۱۱۔ پاکستانی ادب (انتخاب شاعری اردو) ۲۰۰۸ء۔۱۹۴۷ء)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۹

خودنوشت

ا۔	تمنابے تاب	پہلا ایڈیشن	حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۱ء
	ایضاً	دوسرا ایڈیشن	حرف اکادمی، راولپنڈی ۲۰۰۳ء
	ایضاً	تیسرا ایڈیشن	پورب اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

ادارت

ا۔	دستاویز	دستاویز مطبوعات
۲۔	اقراء	ایف.جی ایجوکیشنل ڈائریکٹوریٹ، جی ایچ کیو
۳۔	دریافت	نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو سحز، اسلام آباد
۴۔	تخلیقی ادب	نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو سحز، اسلام آباد
۵۔	معیار	جامعہ اسلامیہ بین الاقوامی، اسلام آباد

اعزازات

ا۔	پرائڈ آف پرفارمنس ۲۰۰۶ء	حکومت پاکستان
۲۔	بیسٹ یونیورسٹی ٹیچر ایوارڈ	ایچ ای سی (حکومتِ پاکستان)
۳۔	میاں محمد بخش ایوارڈ ۲۰۰۴ء	میاں محمد بخش اکیڈمی، پاکستان
۴۔	ایوارڈ آف ایکسیلنس ۲۰۰۲ء	رائٹر اینڈ ایجو کیشنس کلب، پاکستان
۵۔	نقوش ایوارڈ ۹۵۔۱۹۹۴ء	ادارۂ نقوش، پاکستان
۶۔	بہترین استاد	ایف.جی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشن ڈائریکٹوریٹ، حکومت پاکستان

۷۔ سند فضیلت و میڈل، بہترین طلبہ گورڈن کالج گورڈن کالج، راولپنڈی

اعترافِ فن

1. مقالات

رشید امجد کی ادبی خدمات پر ملکی و غیر ملکی جامعات میں ایم۔اے، ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات لکھے گئے۔ ایم اے مقالات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی پر ذیل تحقیقی مقالات لکھے جا چکے ہیں جبکہ کئی مقالات زیرِ تحقیق ہیں۔

ا۔ رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری جائزہ

مقالہ برائے ایم فل (اردو)، علامہ اقبال یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء

۲۔ رشید امجد کی غیر افسانوی نثر

مقالہ برائے ایم فل (اردو)، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۰۹ء

۳۔ رشید امجد کی ادبی خدمات

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (اردو)، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء

2. کتب

اردو ادب کی تحقیقی و تنقیدی کتب میں رشید امجد کا نام خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ ذیل کتب بالخصوص رشید امجد کی ادبی صلاحتیوں کے اعتراف میں لکھی گئی ہیں۔

ا۔ ڈاکٹر صفیہ عباد، رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

۲۔ ڈاکٹر شفیق انجم (ترتیب و تعارف)، رشید امجد—ایک مطالعہ، نقش گر، راولپنڈی، ۲۰۰۹ء

۳۔ ڈاکٹر شفیق انجم ،پاکستانی ادب کے معمار- ڈاکٹر رشید امجد : شخصیت و فن ،اکادمی ادبیات ، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

۴۔احمد اعجاز، کہانی کی کہانی (رشید امجد کی منتخب کہانیاں اور تجزیہ) مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء

۵۔ شمیم ظفر رانا، رشید امجد کی تنقید نگاری، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء

۶۔ڈاکٹر آفتاب آفریدی، رشید امجد۔ فکر و فن عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، انڈیا، س ن